دوستی کا سفر

ڈاکٹر شہناز مزمل

دوستی کا سفر

شہناز مزمل

ندا پبلی کیشنز

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اهتمام : محمد احسن تہامی

مطبع : گنج شکر پرنٹرز

تاریخ اشاعت : 2007

قیمت : 80 روپے

ندا پبلی کیشنز

رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار

لاہور۔54000 فون : 7231119

انتساب

ہمسفروں کے نام

تعارف

نام: شہناز مزمل

تاریخ پیدائش: 10 اپریل

تعلیم: ایم اے لائبریری سائنس

ڈپلومہ سائنٹفک مینجمنٹ (نیدرلینڈ)

ڈی ایچ ایم ایس (D.H.M.S)

مطبوعہ کتب

عشق دا دیوا	ادارہ پنجابی زبان تے ثقافت، ۲۴۔ امیر روڈ بلال گنج لاہور
پیام نو	قلمی نسخہ ۱۹۸۹ء
جذب وحرف	تجدید اشاعت گھر لاہور ۱۹۹۰ء، 46 آر ماڈل ٹاؤن لاہور
جرأت اظہار	تجدید اشاعت گھر لاہور ۱۹۹۰ء، 46 آر ماڈل ٹاؤن لاہور
عکس دیوار پہ تصویر	ذیشان بک پیلس ۱۹۹۱ء، اردو نگر لاہور
موم کے سائبان	پاک بک ایمپائر، ۱۹۹۴ء ۷۰ مزنگ روڈ لاہور
میرے خواب ادھورے ہیں	عمیر پبلشرز لاہور، ۱۹۹۶ء
جادہ عرفان	سبحان پبلی کیشنز، سٹی ٹاور، رائل پارک لاہور ۱۹۹۷ء،
عشق تماشا	ندا پبلی کیشنز، رحمان مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۲
قرض وفا	ندا پبلی کیشنز، رحمان مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۲۰۰۲
Ten Poets of today-10	پاک بک ایمپائر لاہور، ۱۹۹۴ء
عکس خیال۔ شہناز مزمل شخصیت اور فن	سبحان پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء
شہناز مزمل کے منتخب اشعار	ادب سرائے لاہور، ۲۰۰۵

بعد تیرے (اردو شاعری)	ندا پبلی کیشنز، رحمان مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء
دوستی کا سفر (سفرنامہ)	ندا پبلی کیشنز، رحمان مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۷ء
لائبریریوں کا شہر لاہور	مکتبہ الحروف، لاہور ۱۹۹۰ء
فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار	تجدید اشاعت گھر 46 آر ماڈل ٹاؤن لاہور، ۱۹۹۰ء
نماز بچوں کے لیے	سیف بک ہاؤس، اردو بازار لاہور، ۱۹۹۰ء
کتابیات اقبال	قلمی نسخہ ۱۹۸۹ء لاہور
کتابیات مقالہ جات	قلمی نسخہ ۱۹۸۹ء لاہور

زیر طبع کتب

شہناز کی غزلیں	اجلا کون میلا کون (کالموں کا مجموعہ)
گجھیاں پیڑاں (پنجابی شاعری)	کلیات (اردو شاعری)

ادبی ثقافتی ذمے داریاں

چیئرپرسن ادبی تنظیم ''ادب سرائے'' (قائم شدہ ۱۹۸۸ء)

چیئرپرسن ''سلطان میموریل ویلفیئر ٹرسٹ''

چیئرپرسن ''قادری میموریل ویلفیئر ٹرسٹ''

ممبر، لاہور کلچرل کونسل

ممبر رائٹرز گلڈ پاکستان

ممبر حلقہ ارباب ذوق

ممبر پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن (پی ایل اے)

ممبر پنجاب لائبریری سائنس المنائی ایسوسی ایشن (پلسا)

ممبر انٹرنیشنل ویمن کلب

سرپرست اعزازی سہ ماہی ادب سرائے

پتا: 125۔ایف، ماڈل ٹاؤن لاہور

ای میل: shahnazmazamil@hotmail.com

adabsaraae@yahooo.com

ویب سائٹ: www.adabsaraae.com

فون: 0092-42-5832335 موبائل: 0092-300-4275692

ایوارڈز

ایوارڈ حسن کارکردگی، میاں عامر محمود

لٹریری ایوارڈ۔ حسن قلم

جنگ ٹیلنٹ ایوارڈ

ایوارڈ بہترین اردو شاعرہ

سلمیٰ تصدق ایوارڈ

گولڈ میڈل پی ایل اے

تحقیق مقالہ ایم اے اردو 2006 ''شہناز مزمل۔ شخصیت اور فن''

صدف رانی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

سفر

ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرک، لندن، بریڈفورڈ، برمنگھم، مانچسٹر، قطر، بحرین، سعودی عرب، انڈیا، امریکہ

دوستی کا سفر

سفر، مسافر، ہم سفر، مسافت یہ تمام الفاظ اپنے اندر شاعرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کا تصور زندگی کو رنگین بنا دیتا ہے۔ کچھ لوگ سفر سے گھبراتے ہیں، سفر انہیں دوبھر محسوس ہوتا ہے لیکن میں ہمیشہ سے سفر کی شوقین رہی ہوں یا یوں کہہ لیں کہ سفر میری کمزوری ہے۔ ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ، انگلینڈ، بحرین، سعودی عرب کے سفر زندگی کے یادگار سفر تھے۔ یہ تمام سفر یا تو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اور کچھ ادبی تقریبات کے حوالے سے تھے۔ ان ممالک میں ہر دو صورتوں میں اس قدر پذیرائی ملی کہ قدرت کی مہربانیوں کا شکر ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ انڈیا دیکھنے کی خواہش بھی دل کے کسی گوشے میں چھپی تھی مگر سرکاری ملازم ہونے کے ناطے اس خواہش کو کبھی سر نہیں اُٹھانے نہیں دیا۔ چند ماہ قبل فیملی ممبران انڈیا جانے کا پروگرام بنا رہے تھے اور میں صرف خاموشی سے سن رہی تھی۔ ان کو مشورے دے رہی تھی مگر میں خود انڈیا جاؤں گی یہ سوچا بھی نہیں تھا۔

اپریل کے شروع میں کنول مشتاق کا فون آیا کہ ورلڈ پنجابی کانگریس کے تحت دسویں کانفرنس چندی گڑھ میں منعقد ہو رہی ہے۔ 150 لوگوں کا وفد جا رہا ہے، ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی اس میں شرکت کریں۔ اپریل کا مہینہ ذاتی مصروفیت کا مہینہ تھا۔ میں نے انکار کر دیا جس پر مجھے بے حد افسوس بھی ہوا۔ 20 اپریل کو اکیڈمی ادبیات لاہور کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر قاضی جاوید کا فون آیا کہ اب کانفرنس 28 مئی کو ہو گی، آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی اور تصویریں آفس میں جمع کروا دیں۔ مئی کا مہینہ دفتری مصروفیت کے علاوہ فراغت کا تھا۔ میں کھل اُٹھی اور کاغذات جمع کروا دیئے۔ دعوت نامہ ملنے پر اپنے ڈیپارٹمنٹ کو NOC کے لیے لکھا۔ سرکاری ملازمین کے لیے یہ قدرے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ فائلوں کے چکر میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے اور اب تو انڈیا جانے کا مسئلہ تھا۔ IB اور پولیس اسپیشل برانچ، ہوم ڈیپارٹمنٹ سب سے اجازت لینا تھی۔ اپنا ڈیپارٹمنٹ بھی تذبذب کا شکار تھا۔ بدقت یہ مرحلہ 25 مئی تک اختتام پذیر ہوا۔ بہتری یہ ہوئی کہ

گروپ کا ویزہ تھا اس لیے NOC کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ NOC ہمیں بارڈر پر ہی دکھانے کو درکار تھا۔ ورنہ یورپی ممالک کے ویزے کے لیے پہلے NOC لینا پڑتا ہے پھر ویزہ لگتا ہے۔ انڈیا کے سفر کے خواب کو تعبیر ملنے والی تھی۔

27 مئی کی خوش گوار صبح موسم نے اپنا رُخ بدلا تھا۔ چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ جب ہم گھر سے فلیٹیز کے لیے روانہ ہوئے تو درخت جھوم جھوم کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ موسم خوب صورت ہو تو سفر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ہم حسب عادت ٹھیک ساڑھے سات بجے فلیٹیز ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ رخشندہ نوید بھی ابھی اپنا سامان اُتار رہی تھیں۔ لوگ بے حد کم تھے۔ بسوں کا دُور دُور تک نشان نہ تھا۔ ہم ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ پروین عاطف بھی آ گئیں۔ پنڈی کی شمیم جاوید بھی نظر آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ لوگ آنا شروع ہو گئے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد بسیں آئیں۔ سامان رکھنے کو کہا گیا۔ اس قافلے میں پندرہ سولہ خواتین تھیں، پروین عاطف، فرخندہ لودھی، نسرین انجم بھٹی، شناور ڈوگر، ان کی بھتیجی، نیلما ناہید، صغریٰ صدف، رخشندہ نوید، شمیم جاوید، بشریٰ اعجاز، ایک وکیل صاحب کی بیگم، فلم سٹار پنا اور بہار بیگم، چند اور خواتین۔ باقی مرد حضرات تھے جن میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل تھے، ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، صحافی، ادیب، شاعر وغیرہ۔

بس میں سوار ہو گئے تو یاد آیا کہ پاسپورٹ تو ملے نہیں۔ سوچا شاید واہگہ پر دیں۔ بشریٰ اعجاز بس سے نیچے کھڑی تھیں۔ اس نے اشارہ کیا کہ پاسپورٹ مل رہے ہیں لے لو۔ اعتزاز اسلم کے گرد لوگوں کا ایک جم غفیر تھا، نام پکارے جا رہے تھے۔ ہم نے بھی اپنا نام پکارے جانے پر پاسپورٹ بمعہ ویزہ حاصل کر لیا اور دوبارہ بس میں آ بیٹھے۔ تمام لوگوں کے جمع ہو جانے پر بسوں نے روانہ ہونا تھا۔ اجمل نیازی اور فرحت عباس شاہ بھی نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ویزے تو لگوا لیے تھے مگر وہ کسی وجہ سے ہمارے ساتھ اس سفر میں شریک نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اپنے پاسپورٹ واپس لینے آئے تھے۔

بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سورج بھی اپنا رُخ روشن دکھا رہا تھا۔ واہگہ بارڈر پہنچنے پر ایک بار پھر پاسپورٹ ہم سے لے لیے گئے اور ایک کمرے میں اونچے بنے ہوئے شیلفوں پر سامان کو

قطار میں رکھ دیا گیا اور ہمیں انتظار کے لیے کہا گیا۔ خواتین کو ایک کونے میں کرسیاں مل گئیں۔ ہم نے اپنا ڈیرہ وہاں جمالیا۔ بجلی نہیں آ رہی تھی مگر بارش کی وجہ سے موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس پروسس میں لگا۔ اس دوران قلیوں نے کرنسی کی تبدیلی کی مہم شروع کر دی۔ 100 پاکستانی روپوں کے 70 انڈین روپے دے رہے تھے۔ پندرہ سال قبل پاکستانی کرنسی کی قیمت زیادہ تھی۔ 100 پاکستانی روپوں سے 120 انڈین روپے ملتے تھے۔ چند خواتین نے زادِ راہ کے لیے کچھ کرنسی تبدیل کروائی۔ میرے بیٹے نے گزشتہ رات مجھے کرنسی تبدیل کروادی تھی اس لیے میں بے فکر تھی۔ امیگریشن اور کسٹم کے مراحل طے کرنے کے بعد ہم پیدل بابِ آزادی کی جانب روانہ ہوئے۔ خواتین نے اپنا سامان قلیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ فی پھیرا 50 روپے دینا تھا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ قلی مل گئے ورنہ یورپ میں تو اپنا سامان خود اُٹھانا پڑتا ہے۔ شاعروں، ادیبوں کے ساتھ سامان کے علاوہ کتابیں ہوتی ہیں جن کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں وزن کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ کیوں کہ پیدل بارڈر کراس کرنا تھا۔ خوش گوار موسم، لطیف ہواؤں کے جلو میں پاک سرزمین کی سرحد کراس کر کے ہم انڈیا کی سرحد اٹاری میں داخل ہو رہے تھے۔ وہاں دیپک من موہن اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھولوں کے ہار لیے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے پوچھا ورلڈ پنجابی کانگریس؟ ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور انہوں نے ہمیں پھولوں سے لاد دیا۔ اخبار اور ٹی وی کے فوٹو گرافرز جمع ہو گئے۔ دھڑا دھڑ تصویریں اُتر رہی تھیں۔ ہم سے پہلے مدیحہ گوہر اجوکا تھیٹر کے قافلے کے ساتھ یہاں سے گزری تھیں۔ آگے انڈیا کسٹم کلیئرنس کا مسئلہ تھا۔ کاؤنٹر پر دلجیت کور موجود تھیں، انہوں نے بغیر کسی تامل کے ہمارے کاغذات کی پڑتال کی اور تمام مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔ ابھی کچھ لوگ کسٹم کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہم لوگ باہر نکل کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔ ایک لگژری بس مسافروں کو لے کر جا چکی تھی۔ ہمیں دوسری بس کا انتظار تھا۔ کچھ لوگ چائے کافی وغیرہ سے دل بہلا رہے تھے۔ جلد ہی بس آ گئی۔ بس نمبر 5084 جس میں ہمیں مسلسل پانچ روز سفر کرنا تھا، راجو ٹریولز کی ایئر کنڈیشنڈ بس تھی۔ ہمیں پہلے امرتسر جانا تھا۔ امرتسر یہاں سے تیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ ہم نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کیا۔ ہمارے

جیسے کھیت کھلیان، مکان، غربت، اپلے تھاپتی عورتیں، پانی سے بھرے کھیت جن میں چاول کی فصل بوئی جارہی تھی۔ مردوں میں ایک نمایاں فرق ان کی پگڑی کی وجہ سے تھا۔ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر۔ یہ سڑک سنگل تھی۔ دونوں طرف سے ٹریفک آرہا تھا۔ گوردواروں کے مینار بھی نظر آرہے تھے۔ ایک آدھ جگہ مسجد بھی نظر آئی۔ سائیکل رکشہ، اس کو چلاتے ہوئے چمرخ بدن، موٹر سائیکل چلاتی لڑکیاں اور گندگی میں لتھڑے ہوئے کھلے پھرتے ہوئے سور۔ ان دوتین چیزوں نے حیران کیا اور فرق کو واضح کیا کہ ہم اپنے ملک میں نہیں کسی اور ملک میں ہیں۔

بسیں من موہن انٹرنیشنل ہوٹل کے سامنے روک دی گئیں۔ یہاں ڈپٹی کمشنر امرتسر سردار نرمندر سنگھ ستاں پانیاں دی وراثت کے سربراہ ڈاکٹر سورن سنگھ اور جنرل سیکرٹری ڈاکٹر اے ایس ماہل نے تمام پاکستانیوں کو خوش آمدید کہا۔ یہاں دوپہر کے کھانے اور ثقافتی پروگرام کا انتظام تھا۔ ہال میں داخل ہونے پر ہمارا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ ہلکی ہلکی دھنیں بجائی جارہی تھیں۔ پھر انہوں نے اپنے لوک نغمے بھی گائے۔ ہمارے وفد میں شامل روزینہ کوثر نے لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا گایا۔ نیلما ناہید نے امرتسر کے لیے لکھی ہوئی اپنی نظم پڑھی۔ ایک محبت اور امن دوستی کا پیغام تھا جو دونوں اطراف سے دیا جارہا تھا۔ محبتیں گرم جوشی سے لنڈھائی جارہی تھیں۔ مشروب اور سوپ سے میزوں پر تواضع کی جارہی تھی۔ اخباری نمائندوں اور ٹی وی کے نمائندوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ نہیں یہ وہ ملک تو نہیں جس سے دشمنی ہے۔

ایک محبت بھرا دوستانہ ماحول تھا۔ کھانا لگایا گیا۔ ہم لوگ تو اپنے ملک کی طرح بغیر کسی تنظیم کے میزوں کے گرد جا کھڑے ہوئے، میزبانوں نے قطار بنالی اور نظم وضبط کا مظاہرہ کیا۔ بقول پروین عاطف ہم ایک ہجوم ہیں وہ ایک قوم ہے۔ جب ہی ترقی کی طرف گامزن ہیں۔ مغربی ممالک کے اچھے طور طریق اپنا رہے ہیں۔ ہم نے بھی قطار بنانے میں عافیت سمجھی۔

گروپ لیڈر فخر زمان بھی اپنی پجارو میں وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنی محبت اور امن دوستی کا اظہار کر رہے تھے۔ کانگریس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈال رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ یہ سب سے بڑا وفد ہے جو پاکستان سے انڈیا آیا ہے۔ اس میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔

کھانے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔ امرتسر سے آگے سڑک دورویہ تھی۔ پُرتپاک استقبال اور خوش گوار موسم کے باعث سفر اور خوش گوار ہو گیا تھا۔ بارش سے فضا اُجلی اور نکھری نکھری ہو گئی تھی۔ اب دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ ایک جستجو تھی، ایک شوق تھا جو کشاں کشاں آگے لیے جاتا تھا۔ ہمیں جالندھر پہنچ کر رکنا تھا۔ پہلے پروگرام 26 مئی کو روانگی کا تھا اور 27 کا پورا دن جالندھر میں گزارنا تھا۔ مگر اب پروگرام میں تبدیلی تھی۔ وہاں محض رُک کر ریفریشمنٹ کے بعد چندی گڑھ روانہ ہونا تھا کیوں کہ کل یعنی 28 مئی کو کانفرنس کا آغاز ہونا تھا۔

بسیں جالندھر سے باہر ایک ڈھابے جس کا نام حویلی تھا اس کے سامنے رُک گئیں۔ جالندھر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اشوک کمار گپتا اور پریم سنگھ ایڈووکیٹ نے استقبال کیا۔ چھوٹی سرخ اینٹوں سے بنایا گیا ہوٹل جس کے باہر پانی کی پھوار پھینکنے والے پنکھے جو ہوا کو دھند کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں، لگائے گئے تھے۔ باہر باتھ روم تھے انتہائی صاف ستھرے۔ مردوں کے باتھ روم کے باہر گبھرو اور خواتین کے باتھ روم کے باہر مٹیار لکھا ہوا تھا۔ شلوار قمیض میں ملبوس خواتین صفائی پر مامور تھیں۔ ہوٹل کے باہر منشی جی کا مجسمہ اور ایک سرکنڈوں سے بھری گاڑی جس کو جوان چلا رہا ہے بالکل اصل معلوم ہو رہے تھے۔ ہوٹل کے اندر ایک ٹرک کا اگلا حصہ دیوار میں نصب کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تیز رفتار ٹرک دیوار توڑتے ہوئے اندر آ گھسا ہے۔ تواضع خالصتاً پنجاب کے روایتی انداز میں کی گئی۔ بیرے لاچے کرتے اور واسکٹ پہنے ہوئے اسٹیل کے گلاسوں میں میٹھی اور نمکین لسی پیش کر رہے تھے۔ چنے سموسے اور چائے بھی موجود تھی۔ ہوٹل کے ساتھ ایک میوزیم بنایا گیا تھا۔ ہم باہر نکلے تو فخر زمان نے پوچھا میوزیم دیکھا؟ ہم نے کہا نہیں۔ تو بولے جلدی سے دیکھ آؤ۔ وہی تو دیکھنے کی چیز ہے۔ ایسا میوزیم میں نے بحرین میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے کلچر کی نمائندگی کی تھی۔ جب کہ یہاں پنجابی کلچر نظر آ رہا تھا۔ سوہنی مہینوال کے مجسمے ایستادہ کیے گئے تھے۔ مجسموں پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔

تختیاں پکڑے بچے، پانی بھرتی پنہاریاں، جھولا جھولتی مٹیاریں، مرغیوں کو دانہ ڈالتی بڑی بی، سنگھار کرتی الھڑ دوشیزائیں۔ ہم نے وہاں تصویریں وغیرہ بنائیں۔ بسیں جانے کو

تیار تھیں۔

اب ہم چنڈی گڑھ کی طرف روانہ ہو رہے تھے جہاں کانفرنس کا انعقاد ہونا تھا۔ شام کا اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ تاریکی میں چیزیں چھپتی جا رہی تھیں۔ ہم چنڈی گڑھ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ چنڈی گڑھ ہندوستان کا واحد شہر ہے جو ایک نقشے کے مطابق پچاس کی دہائی میں بنایا گیا۔ اسے مختلف سیکٹروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سڑکیں کھلی ہیں۔ اسلام آباد اور چنڈی گڑھ کو جڑواں شہر کہتے ہیں۔ اب جا کر دیکھیں گے کہ ان دونوں میں کیا مماثلت ہے اور کیا فرق ہے۔ بسیں ایک سنسان سی جگہ پر رُک گئیں۔ معلوم ہوا یہاں کھانے کا انتظام ہے۔ سڑک پر سٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ ایسا معلوم نہ ہوتا تھا کہ کوئی بڑی دعوت کا اہتمام ہے۔ پیدل چل کر آگے آ گئے تو داخلی راستے پر بتیاں جل رہی تھیں۔ یہاں سے ان کے فضول خرچ نہ ہونے کا اندازہ ہوا۔ بہت کم گاڑیاں تھیں۔ وہاں پر ڈاکٹر جپ پر پت اور ڈاکٹر رنجنا ہمارے استقبال کو موجود تھیں۔ یہاں تعلیم عام ہے کیوں کہ انڈیا میں ہر دھان پان سی لڑکی نے پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ یہ جگہ کسی کا فارم ہے، چشمہ شاہی اس کا نام ہے۔ اس نے اس فارم کو وفود کے استقبال اور کھانے کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ موسم بدستور خوش گوار تھا۔ لان خوب صورت تھا۔ روشن تھا۔ پانی کا جھرنا مدھر آواز پیدا کر رہا تھا۔ اسنیکس، مشروبات اسلامی اور غیر اسلامی سے تواضع کی گئی۔ اسنیکس اتنی وافر مقدار میں تھیں کہ پیٹ بھر گیا۔ بعد میں کھانے کا بھی انتظام تھا۔ حسب روایت گرم جوشی، محبت، خلوص کی بارش ہو رہی تھی اور ہم بھیگتے جا رہے تھے۔ یہ کیسا دشمن ملک ہے یہاں تو پیار ہی پیار ہے۔ اللہ کرے ہم اپنے محبت بھرے رویوں سے ان نفرتوں کو مٹا ڈالیں، آپس کے اختلافات ختم کر دیں۔ میں نے بے اختیار دُعا کی۔

جنگ تو مسئلوں کا حل نہیں۔ جنگ کا تصور ہی کتنا خوف ناک ہے۔ ڈائیلاگ سے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ یہ پُر خلوص جذبے، یہ نچھاور ہوتی ہوئی محبتیں، ان سے تو یہی اظہار ہوتا ہے ہم جلد ہی کسی بہتر فیصلے پر پہنچ سکیں گے۔ بس چنڈی گڑھ کی طرف جا رہی تھی اور میں سوچوں کا تانا بانا بُن رہی تھی۔ ایک محفوظ مستقبل، ایک محفوظ ملک جہاں آگ و خون کی ہولی نہیں کھیلی جا ئے

گی۔ جہاں کبھی بلیک آوٹ نہیں ہوگا۔ جہاں سرحد پر بسنے والوں کو اپنے ہنستے بستے گھر چھوڑ کر بھاگنا نہیں پڑے گا۔ ہم سب امن کے پیامبر بن کر جا رہے تھے۔ محبتوں کی، دوستی کی، شمع روشن کرنے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ محبتوں کے نشے سے مخمور لوگوں نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ شاید میری طرح وہ بھی خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سڑک پر جلتی دورویہ لائٹس شہر آجانے کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ میں جاگ رہی تھی اور کھلی آنکھوں سے چاندنی میں نہائے ہوئے اس شہر کو دیکھ رہی تھیں جہاں ہمیں قیام کرنا تھا۔ شیوالک ہوٹل ائیر پورٹ سے 11 کلومیٹر اور اسٹیشن سے 8 کلومیٹر پر واقع ہے۔ سرکاری دفاتر اس کے بہت نزدیک ہیں۔ فور سٹار ہوٹل شیوالک ویو کی وسیع پارکنگ میں جا کر بسیں رُک گئیں۔ اب سب لوگ پوری طرح جاگ چکے تھے۔ اپنے اپنے سامان کی تلاش میں تھے۔ سامان کا ڈھیر اور لوگوں کا ہجوم، ہوٹل کے لاؤنج میں میلے کا سماں پیش کر رہا تھا۔ کاؤنٹر پر موجود عملہ سب سے پاسپورٹ جمع کر کے مستعدی سے کمروں کی الاٹمنٹ میں مصروف تھا۔ دو دو لوگوں کو ایک کمرہ الاٹ ہوا۔ مجھے اور نیلما ناہید درانی کو ایک ساتھ کمرہ نمبر 208 ملا۔ آراستہ آرام دہ بیڈ روم۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ کچھ یادداشتیں لکھنا تھیں اور مجھے تمام دن کی نمازیں بھی ادا کرنا تھیں۔ میں اپنے ساتھ اپنی چھوٹی سی جا نماز لے گئی تھی۔ اندازاً قبلے کا رُخ متعین کر کے نماز ادا کی۔ راستے میں ایک PCO سے گھر فون کرلیا تھا اس لیے مطمئن تھی۔ آپ کو جان کر حیرانی ہوگی کہ پاکستانی کال صرف پندرہ روپے میں ہوئی۔ صغریٰ صدف، صابر لودھی اور دیگر احباب نے بھی گھر بات کی۔ اس قدر سستی کال پر سب کو حیرانی تھی۔ ہوٹل سے بھی کال ہوسکتی تھی مگر وہ خاصی مہنگی تھی۔ کرنسی کی تبدیلی کے بارے میں بات ہوئی۔ ہوٹل والے صرف ڈالر لیتے تھے، پاکستانی روپے نہیں۔ ان تمام امور پر گفتگو کرتے کرتے ہم نیند کی وادی میں اُتر گئے۔ میں حسب عادت صبح چار بجے بیدار ہوگئی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد نہا دھو کر کپڑے استری کر لیے۔ استری میں ساتھ لے گئی تھی جس کو تمام خواتین نے استعمال کیا۔ اتنی دیر میں نیلما بھی اُٹھ گئیں اور ہم دونوں نیچے ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لیے چلے گئے۔ ابھی تک ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ کانفرنس کتنے بجے شروع ہوگی۔ نیچے ہال میں قاضی جاوید اور ناصر بشیر موجود

تھے۔انہوں نے بتایا کہ اخبارات نے بہت اچھی کوریج دی ہے اور میری اور نیلما وغیرہ کی استقبال کے موقع کی بہت اچھی تصاویر شائع کی ہیں۔تلاش بسیار کے باوجود وہ اخبار ہمیں نہیں مل سکا۔ان کا روایتی ناشتہ چھوٹے پوری نما پراٹھے، چاول، ناریل کا سالن، آلو کی بھجیا پر مشتمل تھا۔انڈے، ڈبل روٹی، جوس، فروٹ، چائے کافی کا بھی اہتمام تھا۔کانفرنس کا آغاز گیارہ بجے ہونا تھا۔ہم تیاری کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے۔یہاں ایک دل چسپ بات گوش گزار کرتی چلوں کہ میں ہر قسم کے مشینی کام یہاں تک کہ تالا کھولنے کے معاملے میں بھی بہت اناڑی ہوں۔یہی وجہ ہے میرے گھر میں صرف ایک داخلی دروازے کا تالا ہے اور وہ بھی میں بہ مشکل کھول پاتی ہوں۔یہاں پر بھی یہی ہوا کہ کمرہ بند کر دیا تو واپسی پر کمرہ کھولنا مشکل ہو گیا۔ساتھ ہی ہوٹل انتظامیہ کا کمرہ تھا، ان سے مدد طلب کی۔نیلما کا بھی حال میرے جیسا تھا۔جتنے دن ہم وہاں رہے دونوں نے ڈر کے مارے کبھی اکیلے کمرے میں جانے کی جسارت نہیں کی۔یہ الگ بات کہ آخر میں تالا کھولنے کے لیے ہمیں کسی دوسرے کی ہی مدد لینا پڑے۔رخشندہ اور صغریٰ ہماری منتظر تھیں۔انہیں استری درکار تھی۔کانفرنس شروع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔

صغریٰ صدف کو کچھ دوائیں اور کیمرے کی ریل درکار تھی۔اس نے جلدی نیچے آنے کو کہا۔کسی سے کہہ کر وہ گاڑی کا انتظام کر چکی تھی۔ہم نے بھی سوچا چلو شہر کی سیر ہو جائے گی، اسلام آباد سے ملتا جلتا شہر اور بازار تھا۔لیکن اسلام آباد چوں کہ بعد میں بنا ہے اور Well Maintained ہے اس لیے زیادہ خوب صورت ہے اور مزید خوب صورتی اس کے پہاڑ اور بے پناہ سبزہ ہے۔رخشندہ اور نیلما کپڑوں کی دکان میں گھس گئیں جب کہ میں اور صغریٰ صدف دوائیوں کی دکان ڈھونڈتے رہے۔لمبے لمبے برآمدے کراس کر کے بنائے گئے اسٹور پر پہنچے تو وہ سٹور ابھی بند تھا۔ایک خاتون کھڑی تھیں، ان سے مدد چاہی۔وہ بھی کینیڈا سے آئی تھیں مگر کافی عرصے سے یہاں تھیں۔انہوں نے ہمارے ساتھ کافی دُور تک چل کر ہمیں میڈیکل سٹور کا پتہ بتایا۔دوائیوں کی قیمتیں پاکستان سے کم تھیں۔کیمرے میں فلم ڈلوائی۔اس کی قیمت ہماری قیمت کے برابر تھی۔گاڑی میں لانے والے صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں ہمارے منتظر تھے۔کانفرنس

شروع ہونے والی تھی ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ شہر کو گھوم کر دیکھا جائے۔ ہوٹل پہنچے تو کانفرنس ہال ''مجلس'' کے باہر جہاں رجسٹریشن ہو رہی تھی بے حد رش تھا۔ ہم بھی قطار میں شامل ہو گئے اور اپنے نام کا ٹیگ اور بیگ وصول کیا۔ ٹیگ گلے میں پہن کر کانفرنس ہال ''مجلس'' میں داخل ہوئے جہاں 500 لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو پرانے احباب مل رہے تھے۔ میں پہلی دفعہ یہاں آئی تھی اس لیے میرا کوئی واقف نہ تھا۔ میں دوسروں کے ساتھ اپنا تعارف کروا رہی تھی۔ میں نے ہوٹل سے چندی گڑھ کا بروشر حاصل کر لیا تھا۔ کچھ انفارمیشن بیگ میں موجود تھی۔ موقع ملتے ہی اس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔

چندی گڑھ کو انڈیا کا نیا شہر کہہ سکتے ہیں۔ پرائم منسٹر جواہر لعل نہرو کی زیرک نگاہوں نے اس کو دریافت کیا اور فرانسیسی آرکیٹکٹ لی کوربسر اور اس کی ٹیم نے 1952ء میں اس کی منصوبہ بندی کی اور اسے پنجاب اور ہریانہ کے دارالخلافہ کے طور پر تعمیر کروایا۔ چندی گڑھ کا نام اس علاقے میں موجود ایک مندر چندی مندر کے نام پر رکھا گیا۔ چندی جو طاقت کی دیوی ہے اور گڑھ قلعہ یا ٹمپل کے متبادل کے طور پر استعمال ہوا۔ یوں اس کا نام چندی گڑھ پڑا۔ یہ ایک Union Territory ہے۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا کے تحت کام کرتا ہے۔

شہر، خاموشی اور صفائی متضاد چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے بروشر کے مطابق یہ شہر انتہائی پرسکون اور خوب صورت ہے۔ تا حد نظر درختوں اور سبزے میں گھرے ہوئے اس شہر میں فطرت کا حسن آپ کو جا بجا بکھرا نظر آتا ہے۔ عالی شان بلڈنگز، سڑکوں اور فن تعمیر کے خوب صورت نمونوں کے علاوہ اس کو پھولوں اور پھلوں کے پودوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر میں خاص طور پر اس چیز کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کا فطرتی حسن متاثر نہ ہو۔ جگہ جگہ بنائے گئے باغات اور جھیلیں اس کے حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔ سیکٹر 17 اس کا مرکزی علاقہ ہے جو خوب صورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہیں ہوٹل شیوا لک ویو بھی ہے۔ مرکزی دفاتر بھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ بلڈنگ کی شان دار بناوٹ اس کو باقی شہروں سے ممیز کرتی ہے۔ اس خوب صورت پھولوں کی وادی میں ترتیب دیئے گئے باغات میں انسانی حسن وصحت کو برقرار رکھنے کے لیے جوگنگ ٹریکس بنائے

گئے ہیں۔ بوٹینکل گارڈنز ہیں، شاپنگ سینٹرز کے علاوہ جھیلیں اور منفرد انداز سے ترتیب دی گئی لائٹیں سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ اس شہر کی سیاحت سے ایک خاص قسم کی روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ شمال میں واقع سکھنا جھیل اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ اس جھیل کے اطراف میں سیر سیاحوں اور فطرت کے حسن کے متوالوں کو مسحور ومبہوت کر دیتی ہے۔ یہ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی جھیل ہے جسے 1958ء میں تعمیر کیا گیا۔ بارش کے پانی کو تین برساتی نالوں کے ذریعے یہاں جمع کیا جاتا ہے۔ اسے سیاحوں کی جنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی اور چاندنی راتوں کی چاندنی اس کے پانیوں میں عجب حسن پیدا کرتی ہے۔ ڈھلتی شامیں، چاندنی راتیں، جابجا کھلے ہوئے انواع واقسام کے پھولوں کے رنگ اور خوشبوئیں اس کے دیومالائی حسن میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ نفاست سے کٹی ہوئی سرسبز گھاس پر موتیوں کی طرح ٹکے شبنم کے قطرے صبح خیزی کرنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ یہاں پر مختلف اقسام کے آبی جانور بطخیں وغیرہ بھی رکھی گئی ہیں۔ شرلاک رینج کے پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ لوگ جھیل میں کشتی رانی سے بھی محفوظ ہوتے ہیں۔ کہیں پکنک منائی جارہی ہوتی ہے اور کہیں گھنیرے درختوں کے سائے تلے طلباء محو مطالعہ ہوتے ہیں۔ اس جھیل کے کنارے شام اور بھی زیادہ سحرانگیز ہوتی ہے۔ شام کو جھیل کے نزدیک موجودہ ریستورانوں میں زندگی جاگ جاتی ہے۔ بچوں کے لیے طرح طرح کے کھیلوں کے سامان موجود ہیں۔ مصنوعی بنائی گئی پہاڑیوں پر نصب برقی قمقمے جب جگمگا اُٹھتے ہیں تو جھیل کے پانی میں ان کا انوکھا عکس آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پر جم ہے، کلب ہے، سوئمنگ پول ہے، جس کی ممبر شپ حاصل کی جاسکتی ہے۔ ٹینس کورٹ اور گالف کا میدان بھی توجہ کا مرکز ہے۔ جنوب میں ایک چڑیا گھر بھی ہے۔

Rock Garden......شہر کے شمال میں سکھنا جھیل سے متصل 20 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا بین الاقوامی طور پر مشہور یہ باغ پتھروں کے مجسموں اور چٹانوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ باغ فن مجسمہ گری اور پتھر سازی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس کے وسیع وعریض اور کھلے رقبے میں نمائش گاہ اور تھیٹر بھی ہے۔ مجسمہ سازی کے علاوہ پتھروں سے بنائی گئی بھول بھلیاں بھی

سیاحوں کی نگاہوں کا مرکز ہیں۔ یہاں اوپن ائیر میوزیم بھی موجود ہے۔ ان سب چیزوں کا تخلیق کار نیک چند ہے جس نے سات سال بائیسکل پر سفر کر کے شیولاک پہاڑی سلسلے اور اس سے متصل دوسری پہاڑی سلسلوں سے پتھر جمع کر کے یہاں چٹانیں ترتیب دی ہیں اور ان کو قدرتی چٹانوں کا روپ دیا ہے۔ اس نے مختلف کارخانوں کے ضائع شدہ مواد کو جمع کر کے اس کو انسانی مجسموں اور جانوروں کے مجسموں کی شکل میں ڈھالا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اس نے باغ کی تیاری میں تمام ناکارہ سامان مثلاً لوہے کے ٹوٹے ہوئے فریم، مڈگارڈ، کانٹے، ہینڈلز، نائی کی دکان سے جمع کیے ہوئے بال، ٹوٹے ہوئے مجسمے، ناکارہ اسٹریٹ لائٹس، بجلی کا ضائع شدہ سامان، سینٹری کا سامان، کراکری وغیرہ کو مہارت سے اس بمغ کے مجسموں اور چٹانوں اور اطراف کو سجانے کے لیے استعمال کیا ہے۔

یہ باغ ایک تصوراتی ریاست کا نمونہ ہے۔ جیسے ہی اس میں داخل ہوتے ہیں سر جھکائے ہوئے دروازے ہمارا سواگت کرتے ہیں۔ ہم اس طرح کے بہت سے دروازوں اور راستوں سے گزرتے ہیں۔ ہر دروازہ ایک نئی سمت لے جاتا ہے۔ ہر ہر قدم پر فن مجسمہ گری کے حیران کر دینے والے مناظر ہیں۔ سوچتے رہتے ہیں آگے نہ جانے کیا ہوگا۔ اس کے چودہ چیمبرز ہیں۔ ایک طرف مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے انسانی مجسمے ہیں دوسری طرف تالاب، چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ کہیں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں ہیں تو کہیں مہارانیوں کے لیے بنائے گئے تالاب۔ ایک حصہ محلات کی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف گاؤں اور پہاڑ ہیں۔ عقل کو حیران کر دینے والے یہ مناظر ایک انسانی دماغ اور انسانی ہاتھوں کی کرشمہ سازی ہیں۔

بروشر انتہائی دل چسپ تھے اور میں چندی گڑھ کی سیر سے محفوظ ہو چکی تھی۔ بس چشم حیراں نے ان مناظر کو دیکھا تھا۔ ایک آواز نے چونکا دیا۔ یہ دیو سماج کالج آف ایجوکیشن کی پرنسپل مسز ستیندر ڈھلن تھی جو آج شام ہونے والی کالج کی ایک تقریب میں خواتین کو مدعو کرنے آئی تھیں۔ ان کے پُر زور اصرار پر ہم نے وعدہ کر لیا۔ شام کو ٹیگور تھیٹر میں ڈرامہ بھی تھا۔ انہوں نے گاڑی بھجوانے کا وعدہ کیا اور تمام انتظام اپنے ذمے لے لیا۔ ہم چوں کہ نئے تھے اور راستوں سے

ناواقف تھے اسی لیے کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ ابھی کانفرنس شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ دوبارہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہیں ملیں ڈاکٹر بریندر سنگھ جو پنجابی دُوردَرشن میں News Caster ہیں۔ جالندھر سے پروگرام کرتی ہیں۔ چندی گڑھ کا اپنا الگ اسٹیشن ہے۔ نزدیک کھڑی کومل سی لڑکی نے متاثر کیا۔ یہ خوشبو سندھو تھیں، بی اے فائنل ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہیں، میڈیا سے ان کا تعلق ہے۔ یہ سب سے تعارف حاصل کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر بلولندر کور ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونی ورسٹی چندگی گڑھ سے مل کر خوشی ہوئی، Zee News کی انوراج کور جو یونی ورسٹی میں MSC کی سٹوڈنٹ ہیں، پاکستانی خواتین سے ملنے کی متمنی تھیں۔ ڈاکٹر وینتا سنگھ بھی قریبی نشست پر تشریف فرما تھیں۔ سب خواتین انتہائی سادہ، دھیمی آواز، دھیمے مزاج اور منکسر المزاج تھیں۔ لڑکیاں جینز اور چھوٹی شرٹس میں ملبوس تھیں۔ دھیما دھیما شور کچھ اور دھیما ہو گیا تھا۔ لوگ کرسیوں پر بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ کانفرنس کا آغاز ہونے والا تھا۔

کانفرنس شروع ہونے سے قبل نیلما کو ڈاکٹر کملیش موہن نظر آئیں۔ یہ تاریخ کی پروفیسر ہیں اور انڈیا کے نامور شاعر کشمیری لال ذاکر کی بیٹی ہیں۔ نیلما ان سے لاہور میں مل چکی تھیں۔ یہ نویں عالمی پنجابی کانفرنس میں لاہور تشریف لائی تھیں۔ انہوں نے اپنے والد کشمیری لال ذاکر سے ملوایا۔ اتنی معزز شخصیت انتہائی سادہ لباس میں ملبوس عجز و انکساری کا مجسمہ تھے۔ شری رام بھی یہاں موجود تھے۔ انہوں نے تعارف حاصل کیا اور مجھ سے میری کتابیں گورمکھی ترجمے کے لیے طلب کیں۔ اتفاق سے میرے بیگ میں دو کتابیں ''عشق تماشا'' اور ''قرضِ وفا'' موجود تھیں، وہ میں نے ان کو پیش کر دیں۔ انہوں نے نیلما کی نظم ''میں ویکھن آئی آں'' کا فوری طور پر گورمکھی میں ترجمہ کر دیا۔

پہلے اکیڈیمک اور ٹیکنیکل سیشن کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ دیپک من موہن کمپیئرنگ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اسٹیج پر پنجاب کے دو وزیر جن میں سے ایک وزیر ثقافت مسٹر اشون شیکھری اور دوسرے وزیر تعلیم مسٹر ہرنام داس جوہر تھے۔ یہ دونوں وزرائے کرام مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایس ایس نور جو

انڈیا چیمبر کے صدر ہیں۔ فخر زمان جو پاکستانی چیمبر کے صدر ہیں۔ اداکار غلام محی الدین، پرویز عاطف، افضل رندھاوا، ڈاکٹر روہیل سنگھ اور ایس ایس پال اسٹیج پر رونق افروز تھے۔ کلیدی خطبہ ایس ایس ستیندر سنگھ نور کا تھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''پنجابی سبھیا چار دا خطہ'' انہوں نے کہا کہ پنجابی زبان اور پنجابی تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سرحدیں نہیں بدلتیں، صوبائی علاقے بدلتے رہتے ہیں۔ فخر زمان نے اپنے خطاب میں کہا کہ 1984ء میں ہم نے ورلڈ پنجابی کانگریس کی بنیاد رکھی، اس کے لیے ہمیں طعنے سننے پڑے، مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم مستقل مزاج لوگ ہیں۔ ہمارے پائے استقلال ڈگمگائے نہیں ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ پاکستان میں 1986ء، 1992ء، 2001ء میں اس کے تحت کانفرنسز منعقد ہوئیں۔ نویں کانفرنس 2003ء میں لاہور میں ہوئی۔ اب دسویں کانفرنس چندی گڑھ میں ہو رہی ہے۔ گیارہویں کانفرنس اکتوبر میں پٹیالہ میں ہوگی۔ آخری ورلڈ پنجابی کانفرنس اپریل 2005ء میں لاہور میں ہوگی جو پانچ دن جاری رہے گی۔ اس میں 25 ملکوں سے 500 مندوبین شریک ہوں گے۔ اس کانفرنس میں پنجاب، ہریانہ، دہلی اور ہماچل پردیش کے وزرائے عالیٰ کے علاوہ لوک سبھا کے ممبر اداکار دھرمیندر، سنیل دت، راج ببر، جیا پارادا، شترو اور گووندا بھی شریک ہوں گے۔

فخر زمان نے مزید بتایا کہ اس دفعہ وفد میں ہمارے ساتھ 150 لوگ آئے ہیں جس میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ پاکستان سے 30 جرنلسٹ اور 10 ٹی وی چینل بھی ہمارے ساتھ آئے ہیں۔ میڈیا کی شمولیت سے پروجیکشن زیادہ ہوتی ہے۔ یہ کانفرنس امن اور محبت کی عملی تحریک بنے گی۔ اگر دونوں ملک غربت اور جہالت کے خلاف جہاد کریں تو خوش حالی آسکتی ہے۔ انہوں نے ایم اے پنجابی میں 100 نمبر کا گورمکھی رسم الخط کا پرچہ رکھنے کی بھی تجویز پیش کی۔

اداکار غلام محی الدین نے صدر پرویز مشرف اور سابقہ وزیراعظم اٹل بہاری باجپائی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں فخر زمان کا ذاتی طور پر بے حد احترام کرتا ہوں اور مداح ہوں کیوں کہ یہ کسی مقصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے پہلی کلچرل پالیسی دی ہے۔ پنجابی کانفرنسوں کا سلسلہ بھی چلتا رہنا چاہیے تاکہ پنجابیوں میں آپس میں بھائی چارہ مضبوط ہو۔ دونوں

پنجابیوں کی زبان اور کلچر ایک ہے اس لیے میں مشترکہ فلم سازی کی بھی بات کروں گا۔

ناموَر شاعر اور ادیب افضل احسن رندھاوا نے کہا پچاس برس بعد میں نے اپنی جنم بھومی امرتسر کو دیکھا ہے۔ آج پنجاب میں آپ سب کے درمیان موجود ہوں جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اس وقت عجب کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ جذباتی اُتھل پتھل سے نکلوں گا تو کچھ کہوں گا۔

معروف ادیبہ پروین عاطف نے کہا کہ اب دونوں طرف کے لوگوں کو اینٹی نیوکلیئر بات کرنی چاہیے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کھانے کو روٹی نہ ہو اور بم گرانے کی باتیں کی جائیں۔ بم ادھر سے چلے یا اُدھر سے دونوں صورتوں میں نقصان پنجاب کا ہوگا۔ ایک طرف لاہور ہے تو دوسری طرف امرتسر۔ ہم جو پیار محبت اور بھائی چارے کا پیغام لے کر آئے ہیں اسے آگے بڑھنا چاہیے تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان تناؤ ختم ہو۔

پنجابی اکیڈمی دہلی کے جنرل سیکرٹری رویل سنگھ نے کہا کہ ہم نے پنجابی بھاشا کے لیے بہت کام کیا ہے۔ دونوں طرف کے ساتھی تندہی سے اس کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ میں نے بہت سی کانفرنسز میں شرکت کی۔ لاہور بھی گیا۔ سرکاری ملازموں کو NOC کا پرابلم ہوتا ہے اس کے لیے کوشش کی۔ انہوں نے لاہور میں ہونے والی نویں پنجابی کانفرنس کے حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہاں کے وزیراعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی نے پنجابی انسٹی ٹیوٹ بنانے کا اعلان کیا تھا تو اس کے نتیجے میں مشرقی پنجاب میں بھی وزیراعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ نے پٹیالہ میں پنجابی ریسرچ سینٹر بنانے کا اعلان کیا۔ پنجابی کے فروغ کے لیے یہ بہت اہم فیصلے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم پاکستان کی شاہ مکھی کتابوں کو گورمکھی رسم الخط میں بدل رہے ہیں جس سے پڑھنے میں بہت آسانی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ دہلی جیسے شہر میں پنجابی زبان و ادب اور کلچر کے فروغ کے لیے پانچ کروڑ روپے کی گرانٹ بہت کم ہے جس کی وجہ سے ہمارے بہت سے کام رُکے ہوئے ہیں جیسا کہ دہلی میں پنجابی تھیٹر ختم ہورہا ہے۔ ہم سب کو مل کر اس کے لیے کام کرنا ہے۔

شیوانی سکھیری وزیر ثقافت و سیاحت حکومت پنجاب نے دونوں ملکوں کے تعلقات کو مضبوط اور پائیدار بنانے پر زور دیا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ جنرل پرویز مشرف اور من موہن

سنگھ کا تعلق ایک ہی خطے سے ہے اس لیے دونوں امن اور دوستی کے فروغ کے لیے ٹھوس اقدامات کریں۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ پنجاب کے اعلان کو دہراتے ہوئے کہا کہ پٹیالہ میں دو کروڑ روپے کی لاگت سے بین الاقوامی سطح کا ریسرچ سینٹر قائم ہو رہا ہے۔ دوسرا ہرمیندر صاحب کا سنگ بنیاد رکھنے والے حضرت میاں میر کی یاد میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور پاکستان اور گرونانک یونی ورسٹی امرتسر بھارت میں ایک چیئر قائم کی جائے گی جس کا سارا خرچہ بھارتی پنجاب کی حکومت کرے گی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ پاکستان میں کاٹن ریسرچ پر بہت کام ہو رہا ہے۔ دونوں ملک زرعی تحقیقات میں تعاون کریں۔

ہرنام داس جوہر وزیر ہائر ایجوکیشن حکومت پنجاب نے کہا کہ ہمیں جوڑنے والے جذبات کی ترجمانی کرنے والے دیپک من موہن سنگھ جو پنجابیت کی خدمت کر رہے ہیں ان کے ساتھ کام کرنے والے ان کے دوست پال صاحب ہیں جن کی وجہ سے فنکشن اس قدر کامیاب ہوا ہے۔ فخر ہے کہ فخر زمان ہماری ترجمانی ساری دنیا میں کر رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی بھی اس سلسلے میں معاون و مددگار ہیں۔ عالمی پنجابی کانفرنسوں کو جاری رکھتے ہوئے ہم اکتوبر 2004ء میں پٹیالہ میں عالمی پنجابی کانفرنس کروائیں گے۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری فخر الٰہی ......نہیں چوہدری پرویز الٰہی (محفل لالہ زار بن گئی) کو بھی مدعو کریں گے۔ ہم آپ کو دہلی بھی لے کر جائیں گے۔ موقع ملا تو وزیر اعظم من موہن سنگھ سے بھی ملوائیں گے جو ہمارے خطے پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں مل جل کر رہنا چاہیے۔ پنجابی کانفرنسز کے ذریعے ہم ایک دوسرے کے اور نزدیک آئیں گے۔ دُوریاں دُور ہوں گی۔ تالیوں کی گونج میں فخر زمان اور ستیندر سنگھ کو مبارک باد دی۔ کانفرنس کے افتتاحی سیشن میں آں جہانی وزیر اعلیٰ پنجاب بے انت سنگھ کی بیٹی کور کمل سنگھ ایم این اے کانگریس پنجاب دیر تک اسٹیج پر موجود رہیں۔

• پہلا سیشن ختم ہوا۔ کھانا تیار تھا۔ روایتی کھانا پنیر اور مشروم سے مختلف اقسام کے کھانے تیار کیے گئے تھے۔ میزبان قطار بنائے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد کچھ گپ شب کا دَور اور اخباری رپورٹرز، ٹی وی اور ریڈیو کی زد میں رہے۔ انٹرویوز، تصویریں۔ لیکن سب کچھ

بہت منظم طریقے سے۔ تعلقات استوار ہو رہے تھے۔ محبتیں بانٹی جا رہی تھیں۔ تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک طمانیت کا احساس تھا، دوستی کے ہاتھ اور مضبوط ہو رہے تھے۔ ہم ان کی محبتوں کے مقروض ہو رہے تھے۔ یہ وہ قرض ہے جو اُتارنے کے لیے نہیں، سمیٹنے کے لیے ہوتا ہے اور خوش قسمت لوگوں کو محبتوں کا قرض ملتا ہے۔

دوسرے سیشن میں اسٹیج پر وکیل انجم، شفقت مرزا، عمران اکرم بھی موجود تھے۔ دوسرے سیشن کا آغاز ہوا۔ اس میں سوال و جواب بھی ہونا تھے۔ پنجاب یونی ورسٹی پٹیالہ کے پروفیسر سچا سنگھ گل ''دونوں پنجابوں کا اقتصادی تعاون ایک سلگتا ہوا مسئلہ'' کے عنوان سے اپنا پیپر پڑھا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ دونوں پنجابوں کے درمیان فری ٹریڈ آمد و رفت شروع کر کے یورپی یونین کی طرح اس خطے کو کسٹم فری زون بنایا جائے تا کہ دونوں ممالک کے لیے ترقی اور خوش حالی کی راہیں کھل سکی۔ لوگوں نے سوالات کیے۔ انہوں نے نہایت موزوں جواب دیئے۔ جسپر سنگھ نے اپنے مقالے میں کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ کھلا رہنا چاہیے تا کہ پنجابی کلچر کا تبادلہ ہو۔ اس کلچر کو فروغ اور استحکام حاصل ہوگا۔ باہمی اعتبار کی فضا پیدا ہوگی اور ہم بیرونی اقتصادی حملوں سے بچ سکیں گے۔ ہمارا سب کچھ سانجھا ہے۔ سیاسی طور پر ہم اکٹھے نہیں ہو سکے اس لیے دونوں پنجاب بانجھ رہ گئے۔

ڈبلیو ٹی او میں اشیاء کے حوالے سے ٹیکس وغیرہ کی بات کی گئی ہے لیکن کلچر وغیرہ کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہوا۔ اس کا آزادانہ تبادلہ ہونا چاہے اور تعلیم کی طرف خاص توجہ دینا چاہیے کیوں کہ امریکہ اور برطانیہ اور دوسرے ممالک نے اپنی زبان کو اہمیت دے کر ترقی کی ہے جب کہ ہم اپنی تحقیقات کو انگریزی زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔

سوال و جواب کے سیشن میں کیپٹن خالد سلطان ڈی سی لاہور اُجلے سفید لباس میں اسٹیج پر تشریف لائے۔ انہوں نے برجستہ اور شگفتہ انداز میں محفل کی نیا رنگ دیا اور ایک بڑے سنجیدہ موضوع کو ہلکا پھلکا بنا دیا۔ انہوں نے مشرقی پنجاب کی تعلیمی زبان میں ہندی اور سنسکرت الفاظ کے بہ کثرت استعمال پر بات کرتے ہوئے کہا کہ مجھے آپ کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ اس

میں بڑا بھاری پن آ گیا ہے جو مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ میں چکوال کا رہنے والا ہوں۔ اگر میں اپنے گاؤں کی پنجابی بولوں تو شاید آپ کو سمجھ نہ آئے اس لیے میں اپنی بات سمجھانے کے لیے لاہوری پنجابی بولوں گا۔

ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی نے کیپٹن امریندر سنگھ کو سلطان نامی گھوڑا تحفے میں دیا تھا وہ اب کہاں ہے؟ میں نے اسے کہا کہ شاید میرے نام کے ساتھ سلطان کا لاحقہ دیکھ کر اس نے یہ سوال کیا۔ لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ صوبائی معاملہ ہے، اس لیے میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اگر ضلعی معاملہ ہوتا تو کچھ کرتا۔ بہر حال یہ بڑی کامیاب کانفرنس ہے اس پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بے تکلف گفت گو کے ساتھ اس سیشن کا اختتام ہوا۔ دیو سماج کالج سے گاڑی ہمیں لینے کے لیے آ چکی تھی۔ پروین عاطف، فرخندہ لودھی، نیلما ناہید، بشریٰ اعجاز اور مجھے وہاں پہنچنا تھا۔ اس سے قبل ہم فون کرنے کے لیے پال ورک صاحب کی بک شاپ پر گئے۔ بچوں سے بات ہوئی اور یہ کال صرف ہندوستانی 15 روپے میں ہوئی تھی۔

کالج کی دو سینئر سٹاف ممبران ہمیں ساتھ لے جانے کو آئی تھیں۔ ہوٹل شیوا لک ویو سیکٹر 17 میں واقع ہے جب کہ دیو سماج کالج سیکٹر B-36 میں واقع ہے۔ لیکن آج کی تقریب کے لیے انہوں نے کوئی اور ہال لیا ہوا تھا۔ اس کالج کا کوئی کلچرل پروگرام اور تقسیم حسب روایت بہت شاندار تھا۔ پھولوں کے گل دستے، تصاویر، ریڈیو ٹی وی اور محبت، دوستی کا فروغ۔ اندر جا کر علم ہوا کہ اس تقریب کی مہمانِ خصوصی پروین عاطف، فرخندہ لودھی، اور بشریٰ اعجاز تھیں۔ اگلے دن کے مہمان اعزاز، میں اور نیلما ناہید تھے۔ تقریب کے آغاز میں پرنسپل مسز سنیند ر ڈھلوں نے کالج کا تعارف کروایا۔

انہوں نے بتایا کہ دیو سماج سوسائٹی جو کہ ایک مذہبی تنظیم ہے اس نے 1981ء میں دیو سماج آف ایجوکیشن کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے قیام کا مقصد خواتین کو سماجی، مذہبی، ثقافتی اور روحانی اقدار سے روشناس کروانا تھا۔ اس ادارے کی بانی بھگوڈیو آتما جی کی خواہش تھی کہ خواتین

معاشرے کا ایک ناکارہ حصہ بننے کی بجائے تعمیراتی اور مثبت اور تخلیقی کاموں کی طرف توجہ دیں تاکہ وہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مثال بن سکیں۔ دیوسماج سوسائٹی پورے ملک میں اس طرح کے 26 ادارے چلا رہی ہے۔ یہ سوسائٹی ایسے ادارے قائم کر کے اور خواتین کو آرٹ اور کرافٹ کی تعلیم سے بہرہ ور کر کے ہندوستان کے تعلیمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے۔

یہاں دو طرح کے کورسز کروائے جاتے ہیں۔ بیچلر آف ایجوکیشن پروگرام اور ماسٹر آف ایجوکیشن پروگرام۔ بیچلر آف ایجوکیشن پروگرام اپنے 33 سال مکمل کر چکا ہے جب کہ ماسٹرز کے پروگرام کو جاری ہوئے ابھی چھ سال ہوئے ہیں۔ ادارے کی کارکردگی اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر اب یہ ادارہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اِن ایجوکیشنل مینجمنٹ کورس بھی شروع کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے جس سے تحقیقی میدان میں بھی ترقی ہوگی۔ اس دارے میں درج ذیل شعبہ جات ہے:

1- اسٹڈی اینڈ کانفرنس ایریا
2- کمپیوٹرائزڈ لائبریری
3- کمپیوٹر روم
4- آڈیو ویژول روم
5- سپورٹس روم
6- گائیڈینس اینڈ کونسلنگ سیل
7- سائنس لیبارٹری
8- لینگویج لیبارٹری
9- ہاؤسنگ اینڈ بورڈنگ

اس کالج کے پروگرام میں اس کی طالبات برابر کی حصہ دار ہوتی ہیں۔ یہاں سے ان کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس کے قائم کردہ دیگر اداروں میں بطور انسٹرکٹر تعینات کر دیا جاتا ہے۔ ان کو مستقبل میں تحقیق کی طرف مائل کیا جاتا ہے جس کے لیے وقتاً فوقتاً سیمینار، کانفرنسز اور ورکشاپس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ معاشرے کی خدمت اور فلاح کے لیے اس کے کمیونٹی سروس پراجیکٹس بھی ہیں۔ طالبات اور انسٹرکٹر اس میں بھرپور حصہ لیتی ہیں۔ دورانِ تعلیم بھی وہ درج ذیل پراجیکٹس پر کام کرتی ہیں:

(☆) یہاں کا ایک نزدیکی گاؤں کھیری کو خصوصی طور پر خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کو ہم کالج کا بیس کیمپ کہہ سکتے ہیں۔ (☆) ہر سال کالج کی مقرر کردہ ٹیم سیکٹر 26 میں واقع بلائنڈ سینٹر میں بھیجی جاتی ہے، یہاں پر وہ طلباء کے لیے لبرل اسٹیوگرافی کے لیے اسباق تیار کرتی ہے۔ (☆) کالج کی مقرر کردہ ٹیم خون کے عطیات بھی جمع کرتی ہے۔ (☆) انہوں نے ایک کلب بنایا ہے جس کا مقصد بچوں میں جانوروں کے لیے محبت کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ (☆) ایک کلب بوڑھوں کے لیے بنایا گیا ہے جہاں جوانوں اور بچوں کو اپنے بزرگوں کی تعظیم، احترام اور محبت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ (☆) خواتین اور بچوں کی مجرمانہ ذہنیت کو درست کرنے کے لیے ایک کلب کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، یہاں قیدی بچوں اور خواتین کو تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ معاشرے کے کارآمد شہری بن سکیں۔ (☆) Sayhog کا مقصد خواتین اور بچوں میں ماحولیاتی تعلیم کو فروغ دینا ہے، جہاں انہیں ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ (☆) بے گھر خواتین کے لیے بھی ایک ادارہ تشکیل دیا گیا ہے۔ (☆) ہر سال ایک دس روزہ ورکشاپ کا اہتمام گرمیوں کی چھٹیوں میں کیا جاتا ہے، اس میں معذور بچوں کی خدمت کے پروگرام شامل ہیں۔ (☆) قومی تہواروں کو منانے کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد کالج کے کلچرل شو کا باقاعدہ آغاز ہوا، موسیقی، گانا، ڈانس ان کے کلچر کا حصہ ہے۔ قدرت نے ان کو سُر بھی عطا کیا ہے اور ان کے جسموں کو نزاکت اور لچک سے بھی نوازا ہے۔ موسیقی کی مدھر دھنوں اور گائیکی نے مسحور کر دیا اور ان کے روایتی ڈانس دیکھ کر ہم مبہوت رہ گئے۔ ٹیگور تھیٹر ڈرامہ دیکھنے جانے کا وقت ہو چکا تھا اس لیے اتنے خوب صورت پروگرام کو چھوڑ کر کل دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے ان سے اجازت چاہی، گاڑی تیار تھی، میں اور نیلما ناہید اس گاڑی میں ٹیگور ڈرامہ تھیٹر پہنچے۔

اجو کا تھیٹر نے ڈرامے کا اہتمام کیا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ ہال کے اطراف درختوں کے گھنے سائے تھے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ پرانی طرز کا بنا ہوا ہال تھا، ہم جلدی پہنچ گئے تھے اس لیے بیٹھنے کو مناسب جگہ مل گئی۔ ڈرامے کا نام تھا "جنھے لہور نئیں ویکھیا او جمیا

نمیں'' یہ ڈرامہ 1947ء کے فسادات اور فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی تھا۔ ڈرامے کا مرکزی کردار ایک بوڑھی عورت تھی جس کا سارا خاندان قتل ہو چکا ہے۔ یہ کردار مادھوری کٹاریہ نے ادا کیا جو چندی گڑھ میں سینئر مجسٹریٹ ہیں۔ اس ڈرامے کے بعد بھارتی پنجاب کے نام ور لوک فن کار اور رقاص پمی بھائی گروپ اور اس کے ساتھی کنول جیت وغیرہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ڈرامے کے بعد جو بوجھل پن پیدا ہو گیا تھا، موسیقی اور گائیکی نے اس بوجھل پن کو دُور کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں سشما شاہی پہنچنا تھا۔ اس ڈنر کا اہتمام پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کے وائس چانسلر نے کیا تھا۔

آج کا اہتمام گزشتہ روز سے قدرے مختلف تھا۔ فارم کے نزدیک سٹریٹ کو لائٹوں سے سجایا گیا تھا۔ گاڑیوں اور لوگوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ خواتین بھی کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ جینز اور چھوٹی قمیضوں میں ملبوس نوعمر لڑکیاں، پٹیالہ شلوار قمیض پہنے خواتین، ساڑھی بہت کم خواتین نے زیب تن کی تھی۔ آج لان میں موجود لوہے کے فریم جیسے جنگلے کو لائٹوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ان کے درمیان دائرے کی شکل میں کرسیاں رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا۔ آج اسنیکس بنانے کا انتظام بھی لان میں تھا۔ سوپ، مشروب اسلامی اور غیر اسلامی اور ساتھ مختلف اقسام کے پکوڑے نما اسنیکس سے تواضع کی جا رہی تھی۔ خواتین نیم دائرے کی شکل میں اس خوب صورت ترتیب میں براجمان تھیں۔ تبادلہ خیال ہو رہا تھا، محبتیں لنڈھائی جا رہی تھیں۔ ہماری ٹیم میں فلم ساز بہار اور پنّا بیگم بھی شامل تھیں جو لوگوں کی توجہ کا مرکز تھیں۔ ہلکی ہلکی دھنیں بجائی جا رہی تھیں۔ کھانے کا انتظام ہال میں تھا۔ روایتی مزے دار کھانا۔ تمام دن کی بھرپور مصروفیت کے باعث تھکن کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ ماحول کی خوب صورتی اور پرخلوص چاہتوں نے قدم جکڑ رکھے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر راجو ٹریولز کی بس نمبر 5048 میں بیٹھ کر شیوالک ہوٹل جا پہنچے۔ شیوالک ہوٹل کی پرشکوہ عمارت چاندنی میں نہائی ہوئی تھی اور ہمیں اپنے کمرے میں پہنچنے کی جلدی تھی تا کہ نماز کی ادائیگی کے بعد آرام کیا جا سکے۔ کمرے میں پہنچ کر بچوں کا خیال آیا۔ وہاں بھی رات ہو رہی ہوگی۔ موسم نہ جانے کیسا ہوگا۔ چاند وہاں بھی نکلا ہوگا۔ میرے بچے میری واپسی کے دن گن رہے ہوں گے۔ آنکھیں

نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں مگر میں سونا نہیں چاہ رہی تھی۔

صبح بہت خوش گوار تھی، نماز کے بعد میں نے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ سبزے کی اوٹ سے صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ سڑک پر اِکا دُکا گاڑیاں چلتی نظر آ رہی تھیں۔ نیلما بھی بیدار ہو چکی تھیں اور ہم دونوں ناشتے پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ نیچے اُترے تو اخبار منتظر تھے جس میں ہمارے انٹرویوز اور تصویریں تھیں۔ ناصر بشیر نے اخباروں کی نشان دہی کی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں اور نیلما باہر سڑک پر نکل آئے۔ ابھی شہر پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی جگہ دیکھی جائے لیکن کوئی گائیڈ نہ تھا اور ہم اجنبی تھے۔ اسی سڑک پر چکر لگا کر واپس آ گئے اور کانفرنس میں شرکت کے لیے تیاری شروع کی۔ اوپر لابی میں صغریٰ صدف، اور رخشندہ نوید بھی موجود تھیں۔ نسرین انجم بھٹی کو استری کی ضرورت تھی۔ ہم نیچے اُترے تو کچھ باراتی ایک دولہا کے ساتھ لاؤنج میں موجود تھے۔ یہ بارات لے کر دلہن بیاہنے جا رہے تھے۔ ہم نے دولہا کی اور اس کے رشتہ دار خواتین کی تصاویر بنائیں۔ باہر کتابوں کا سٹال موجود تھا۔ یہاں پر گورمکھی زبان میں کتابیں تھیں۔ ہم نے بھی اپنی اُردو کی کتب سٹال پر رکھوا دیں۔ نیلما کی کتاب ''چانن کتھے ہویا'' بھی سٹال پر موجود تھی۔ یہاں پر گورمکھی سکرپٹ پڑھا جاتا ہے اس لیے ہماری کتابوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ہاں اگر کوئی اُردو پڑھنے والا آیا تو وہ کتابیں دیکھ سکتا تھا۔ پال ورک کا اپنا بک سٹال ہے۔ منتظمین میں پال ورک شامل تھے اور ان کے لوگ اور عملہ معلومات فراہم کرنے اور راہنمائی کرنے میں پیش پیش تھا۔ میڈیا کے لوگ بھی موجود تھے۔ اتنے میں ستیندر سنگھ نور، جن کو ایس ایس نور کے نام سے پہچانا جاتا تھا، بک سٹال کے باہر نظر آئے۔ ان سے تعارف حاصل کیا۔ اپنی کتابیں ''عشق تماشا''، ''قرضِ وفا'' اور ''میرے خواب ادھورے ہیں'' ان کو پیش کیں۔ فوٹو گرافر دھڑا دھڑ تصویریں بنا رہے تھے۔ ایس ایس نور اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے کہ امن و دوستی کے اس قسم کے وفود کا تبادلہ دونوں ملکوں میں افہام و تفہیم کے راستے کھولے گا۔ ہم باہمی محبت سے بہت سے مسائل حل کر لیں گے۔ ایک خوش آئند خواب ایک خوب صورت لمحہ ہمارے سامنے تھا اور ہم دُعا مانگ رہے تھے کہ کاش تمام مسائل ڈائیلاگ سے حل ہو جائیں۔ اے کاش

امن دوستی کی تمام کاوشیں بار آور ہوں۔

ہال کے اندر داخل ہوئے تو شری رام کے ہاتھ میں شائستہ حبیب کی کتاب ''میں کیہ ء تے چانن'' گورمکھی سکرپٹ میں موجود تھی۔ انہوں نے ہماری کتابیں بھی اس وعدے پر لیں کہ وہ ان کو گورمکھی سکرپٹ میں تبدیل کر دیں گے۔ ان کی بہت ہی حلیم الطبع اور نفیس شخصیت تھی۔ وہ چندی گڑھ کے رہائشی تھے اور یہاں کے بارے میں ہمیں کافی معلومات فراہم کیں۔ نیتو سنگھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ پنجاب یونی ورسٹی کی شعبہ پنجابی کی ہیں، انہیں میں نے اپنی اُردو شاعری کی تین کتب شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کے لیے دیں۔

پتہ چلا کہ آج کی کانفرنس کے آغاز سے قبل صبح نو بجے پنجاب یونی ورسٹی چندی گڑھ کے وائس چانسلر مسٹر کم ایم پھانک نے پاکستانی شاعر ڈاکٹر خالد جاوید جان کی کتاب ''میں باغی ہوں'' کے گورمکھی ایڈیشن کی رونمائی کے لیے فخر زمان سمیت کچھ صحافیوں کو یونی ورسٹی کے کمیٹی روم میں چائے پر مدعو کیا ہے۔ اس مختصر سی تقریب میں ضیا کھوکھر، تنویر ظہور، رؤف ظفر، وکیل انجم، زمان خان، ڈاکٹر ماہل ستیاپال، ظہور اقبال، دیونیدر سنگھ، اورنگ زیب، اوشا گپتا، عابد گوندل، من موہن دیپک اور ناصر بشیر شامل تھے۔ ناصر بشیر نے اپنی اُردو شاعری کی کتاب ''منظر بدل گئے'' کی تین جلدیں یونی ورسٹی لائبریری شعبہ اُردو کے لیے وائس چانسلر کو پیش کیں۔

کانفرنس کا آغاز ہونے والا تھا۔ آج دوسرا دن تھا۔ میں نے حسب عادت فرنٹ سیٹ سنبھالی۔ مجھے پیچھے بیٹھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ سمجھ نہ آ رہا ہو۔ دورانِ تعلیم بھی میرا یہی معمول رہا۔ میرے برابر ناصر بشیر بیٹھا تھا۔ وہ بھی نوٹس لے رہا تھا۔ آج اسٹیج پر حمید اختر، قاضی جاوید، نسرین انجم بھٹی، پروفیسر مہتہ، بشریٰ اعجاز، ونیتا سنگھ براجمان تھے۔

قاضی جاوید جو اکیڈیمی ادبیات کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر ہیں بہت سی کتابوں کے مصنف، کالم نگار اور فلسفے پر عبور رکھتے ہیں۔ پاکستان کے مشہور دانش ور ہیں۔ انہوں نے OrganizationTrade کے حوالے سے اپنا مضمون پڑھا۔ انہوں نے کہا کہ بابا گورونانک نے نسلی وثقافتی بنیاد اور انسانی دوستی کی بنیاد پر سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ انسانیت کے آخری

نمائندے مغل ہندوستان میں جو کچھ چھوڑ گئے، اس کے خلاف ردعمل ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان مغرب کے غلبے میں زیادہ آرہے ہیں۔ جینز کلچر دونوں طرف نظر آتا ہے۔ لیکن آج امریکن کلچر کے ساتھ ساتھ اپنی شناخت کے کھوج کا احساس بڑھ گیا ہے۔ جالندھر حویلی دیکھی، بدلتے سماج میں اپنے کلچر کو محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک طرف ہم اپنی ثقافت کو بچانا چاہتے ہیں دوسری طرف پوری دنیا سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ تضاد پیدا ہو رہا ہے۔ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن رہی ہے۔ 50 سال بعد بھی پنجاب ایسا ہی ہوگا لیکن کلچر میں تبدیلی ضرور آئے گی۔ لیکن اگر پنجاب اپنی روح اور شناخت کو قائم رکھے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی زبان کو اپنی شناخت بنانے میں آج کی تحریک محرک ثابت ہوگی۔ ہم کسی دوسری زبان کی مخالفت نہیں کرتے۔ انگریزی زبان ہماری ضرورت ہے لیکن پنجابی ہماری شناخت ہے۔ اس کا فروغ اور ترقی ضروری ہے کیوں کہ یہ ایک ایسی زبان ہے جس کے بولنے والے پوری دنیا میں موجود ہیں۔ ہماری تحریک تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے جو ایک خوش آئند قدم ہے۔

پروفیسر مہتہ نے کہا کہ اگر آج پاکستان کو کہا جائے کہ دونوں ملکوں کے درمیان فلموں کا تبادلہ ہونا چاہیے تو وہ نہیں مانیں گے۔ لیکن ڈبلیو ٹی او کے معاہدے کے تحت ایسا ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ بھارت ڈبلیو ٹی او میں یہ مقدمہ کیوں نہیں لے کر گیا؟ دونوں ملکوں کے درمیان آزاد تجارت ہونی چاہیے۔ پاکستان کے عوام انڈین فلمیں دیکھتے ہیں لیکن ہم پاکستانی فلمیں نہیں دیکھ پاتے۔ میرے خیال میں واہگہ بارڈر ہی نہیں فیروزوالہ میں گنڈا سنگھ بارڈر کھل جائے تو یہ عوام کے لیے اتنا ہی فائدہ مند ہوگا جتنا واہگہ۔ کیوں کہ بھارتی پنجاب کی کپاس پاکستان کی ٹیکسٹائل صنعت کے کام آسکتی ہے۔

نسرین انجم بھٹی ہم پنجاب کی سانجھ کی بات کر رہے ہیں۔ میں آج زبانی بات کر رہی ہوں۔ بہت سی باتیں ہو چکی ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ گرے ہوئے بیر اگر پیروں کے نیچے آجائیں تو کچھ نہیں رہتا۔ اگر گرے ہوئے سنبھال لو تو کچھ بچ جاتا ہے۔ یہی بہتر ہے۔ پنجابی بولیں، چرخے، چکی، کنالی اور ہانڈی ہمارے کلچر کا حصہ ہوں۔ کھلے بازو اور کھلے ہاتھوں

سے ملیں۔ ایسا نہ کریں کہ جب ضرورت ہوا کٹھے کرلیں جب ضرورت نہ ہو تو الگ کرلیں۔ پنجاب کی سانجھ کلچر کی سانجھ ہے۔ کیا یہ جرأت ہم دونوں پنجابوں کو مل کر آگے بڑھانے کی کسی دوسری طاقت کے بل بوتے پر تو نہیں کر رہے۔ سانجھ اور ثقافت کو اب اکٹھے کرنا پڑے گا۔

عزیز مظہر نے کہا کہ ادیب، شاعر، دانش ور اور لوک ورثے کو اکٹھا کیا ہے۔ اس میں سانجھ کو ترقی دی جا رہی ہے تا کہ ہم اپنے آپ کو سنبھال سکیں۔ مغربی دنیا کی یلغار کو ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بھائی چارہ بڑھائیں تا کہ پہچان برقرار رہے۔ ہر کانفرنس پہلے سے زیادہ مضبوط ہو رہی ہے۔ کئی ماڈل بن سکتے ہیں جس سے رکاوٹیں دُور ہو سکتی ہیں۔ ترجمے ہوں، گورمکھی میں چھاپے جائیں، پنجابی پرچے میں گورمکھی ضروری ہو، شاہ مکھی اور گورمکھی کو رواج دیں۔ کیا ہم ایک دوسرے سے الگ تو نہیں ہو رہے۔ پنجابی اور سرائیکی دونوں میں فرق پیدا ہو رہا ہے۔ رسم الخط مشکل چیز نہیں۔ اس سانجھ سے جو زبان اُبھرے گی اس میں زیادہ اشتراک اور یکسانیت ہوگی، یگانیت ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی سیشن کا اختتام ہوا۔ کھانے کا وقفہ تھا اور میزبان حسب روایت قطار بنا رہے تھے۔ ہمارے لوگ میل ملاپ میں مصروف تھے۔ کچھ لوگوں کا پروگرام کھانے کے بعد شہر کا چکر لگانے کا تھا۔ کھانا گرم اور مزیدار تھا۔ بعد میں چائے اور آئس کریم کا بھی انتظام تھا۔ ان کے ڈسپلن سے ہم بے حد مرعوب ہوئے۔ سب لوگ سادہ، پرسکون، وقت کے پابند۔ اسی لیے کسی کو کوئی جلدی نہیں، افراتفری نہیں۔ ایک مہذب اور منظم قوم جو ہمیں ترغیب کی دعوت دے رہی تھی۔

نیلما، رخشندہ، صغریٰ صدف اور میں نے بازار جانے کا پروگرام بنایا۔ صغریٰ صدف نے گاڑی کا انتظام کرلیا تھا جس میں ہمیں ایک سستے بازار جسے ریڑھی بازار کہتے ہیں جانا تھا کیوں کہ شیوالک ہوٹل کے قریب واقع بازار خاصا مہنگا تھا۔ وہاں سے خریداری ممکن نہ تھی۔ رخشندہ ہم سے پہلے اکیلے ہی ایک چکر بازار کا لگا آئی تھی۔ وہ ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔ گرمی کی شدت کا باہر نکل کر اندازہ ہوا۔ سڑکوں پر کاریں کم تھیں۔ سائیکل رکشہ جسے ضعیف و نزار کالی چمڑی والے لوگ چلا رہے تھے، ہر طرف دکھائی دے رہی تھی۔ اس امیر شہر میں جو دو صوبوں کا دارالخلافہ

ہے، یہ تضاد بہت تکلیف دہ تھا۔ سکوٹر چلاتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر دل خوش ہوا کہ ان کے اندر اتنی خود اعتمادی ہے۔ چندی گڑھ میں ٹریفک پولیس سکوٹر چلانے والی لڑکیوں کو روک کر چالان بھی کر رہی تھی تاکہ وہ ہیلمٹ پہن کر سکوٹر چلائیں۔ یہاں گاڑی میں بیٹھ کر بغیر بیلٹ باندھے گاڑی چلانا بھی جرم ہے۔ نہ صرف ڈرائیور بلکہ ساتھ بیٹھے ہوئے فرد کو بھی اس کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ سڑکوں پر پولیس والے کم دکھائی دیتے ہیں۔ پولیس کی گاڑیوں کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ یہ پرانے ڈیزائن کی گاڑیاں ہیں۔ کسی قسم کا تصنع، نمود و نمائش زندگی کے کسی پہلو میں نظر نہیں آتی۔ واقعی یہ ریڑھی بازار تھا۔ ہم گاڑی سے اُترے، پاکستان کی طرح کچھ دکانیں تھڑوں پر لگی تھیں۔ مول بھاؤ یہاں ہو سکتا تھا۔ چیزیں سستی تھیں مگر ورائٹی نہیں تھی۔ اجنبی جگہ پر گم ہو جانے کا خوف بھی غالب تھا۔ اس خوف میں، میں صحیح طرح چیزیں بھی نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ میری نظریں کبھی رخشندہ کو ڈھونڈتیں اور کبھی صغریٰ صدف کو۔ نیلما میرے ساتھ تھی۔ چار بجے مشاعرے میں بھی پہنچنا تھا۔ ہمیں ایک جگہ سے بہت کم قیمت میں انڈیا کے بنے ہوئے فینسی دوپٹے جن کی قیمت پاکستان میں چار گنا ہے مل گئے۔ اس طرح کے صرف چار دوپٹے اس کے پاس تھے، دو دوپٹے میں نے اور دو نیلما نے خرید لیے۔ سرخ رنگ کے چنری جیسے دوپٹے جس میں گوٹے کی تاریں بھی تھیں۔ گرمی بھی اپنا زور دکھا رہی تھی۔ میرا شاپنگ میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ جلد از جلد واپس پہنچنا چاہتی تھی۔

بازار کی بھول بھلیوں سے اپنی ساتھیوں کو تلاش کرتے باہر نکلے تو ڈرائیور نے بتایا کہ صغریٰ صدف اور رخشندہ نوید ہمیں تلاش کرنے گئی ہیں۔ دوبارہ ان کی تلاش میں نکلنے سے بہتر یہ سمجھا کہ یہیں رُک کر ان کا انتظار کیا جائے۔ سامنے ایک سائیکل رکشہ نظر آیا۔ اس میں بیٹھ کر تصویر بنوائی۔ اتفاقاً وہ تصویریں میرے اور نیلما دونوں کے کیمروں میں آؤٹ آف فوکس ہو گئیں۔ رخشندہ کافی ساری خریداری کر کے واپس آ رہی تھیں۔ گاڑی نے ہمیں شیوالک ویو چھوڑا۔ ہم نے جلدی سے اکٹھے جا کر کمرے میں سامان چھوڑا اور نیچے ہال میں مشاعرے کے لیے جا پہنچے۔ لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہال بھرتا چلا جا رہا تھا۔

مشاعرے کا مزہ جب ہی آتا ہے جب کہ سامعین صاحب ذوق ہوں اور کثیر تعداد

میں ہوں۔ ہال میں مجمع کو دیکھ کر ان کے صاحب ذوق ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ لوگ دُور دُور سے آئے ہوئے تھے اور کھانے کے بعد واپس نہیں گئے تھے بلکہ شعراء اور مشاعرے کے منتظر تھے۔ طے یہ پایا کہ میزبان ملک کے شعراء مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے تا کہ مہمان شعراء کو بھرپور طریقے سے سنا جا سکے۔ 35 شعراء نے کلام سنایا۔ اس مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر اے جی جوش نے فرمائی۔ افضال شاہد نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں سے چند ایک نام نیلما ناہید، صغریٰ صدف، رخشندہ نوید، شمیم جاوید، بشریٰ اعجاز، نسرین انجم بھٹی، اعزاز احمد آذر، عباس مرزا، ناصر بشیر، شفیق قریشی، طالب بخاری، تنویر ظہور، محمد افضل رندھاوا، عاصم بخاری، خالد جان، ارشد جاوید، احسان اکبر اور فضل الٰہی، سلیم طاہر، ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد ہیں۔ راقمہ نے بھی اپنی نظم "سوچ دی گنڈھری" اور چند اشعار سنائے۔ یہاں یہ بتاتی چلوں کہ خواتین کے کلام کو بے حد سراہا گیا۔ اس دفعہ بھی خواتین بازی لے گئیں۔ تمام شعراء کے کلام کا ذکر یہاں ممکن نہیں، اپنے سنائے ہوئے شعر اور نظم تحریر کرتی ہوں۔

سوچ دی گنڈھری

فیر خالی اے کشکول مرا
میری سوچ دا بوہا کھول ذرا
فیر خالی اے کشکول مرا
مرے اندر بھانبھڑ بلدے نیں
اکھاں وِچ سفنے پلدے نیں
مرے اندر سوچ دی گنڈھری اے
پر سوچ نمانی چندری اے
کجھ گنڈھری چُک لیاواں میں
کجھ خیر فکر دی پاواں میں
ہن توں دس کدھر جاواں میں

کیہ سُفنے سارے توڑ دیاں
یاں بھانبھڑ سارے موڑ دیاں
یاں دل کملے دی من جاواں
جگ سارا پچھے چھوڑ دیاں
اکھاں وِچ اتھرو آئے نیں
یاداں نے دیپ جلائے نیں
میں کملی ہو کے پھر دی آں
فیر خالی اے کشکول مرا
توں بھر دے ہن کشکول مرا
توں اندر میرے بول ذرا
فیر خالی اے کشکول مرا
توں بھر دے ہن کشکول مرا
توں اندر میرے بول ذرا
توں اندر میرے بول ذرا

....

بابا گرونانک

وقت اولڑا ایسا آیا
رات نے ہر سو ڈیرا لایا
وکھرے وکھرے چولے پا کے
ہر اِک وکھرا دیپ جلایا
سمجھ کسے نوں کجھ نہ آیا
منزل دا رستا نہ پایا

سارے بندے اِس دنیا دے
اکو رب نوں منن والے
مذہب بے شک وکھرا سبھ دا
عاشق نیں اُس رب دے سارے
سبق جیہڑا احمدؐ نے پڑھایا
ہر اِک نے اُس نوں دُہرایا
جدوں وی اوکھا ویلا آیا
رب سوہنے رہبر بھجوایا
بُدھا آئے رامن آئے
رشی تے کرشن آئے
پنج دریاواں دی دھرتی
لالچ حسد نے ڈیرا لایا
دھرتی نوں فیر پاک کرن لئی
بابا گرونانک آیا
اوہدی ہستی سوہنی سچی
اوہنے وی گل ایہو دَسی
مل جل کے سبھ رہنا سکھو
دُکھ ونڈاؤ مل کے ہسو
بندا بندے دا دارو اے
اِک دُوجے دے بن کے وسو
عاشق رب دا گرونانک
سجن سبھ دا گرونانک

رب دی رحمت گرونانک
جگ دی عظمت گرونانک
گرونانک دا فرمایا
ساری دنیا دے کم آیا
سبھ نے اُسدا قول نبھایا
ہر اِک نے اُس نوں اپنایا
دُور ہوئی جگ توں بریائی
ہر پاسوں فیر واج ایہ آئی
بابا گرونانک آیا
امن وامان نے ڈیرا پایا
بابا گرونانک آیا

....

دل دیاں دل وچ رہ گئیاں نیں
سب نوں اپنیاں پے گئیاں نیں
چپ وَٹی بیٹھے نے سارے
اکھاں سب کجھ کہہ گئیاں نیں
کجھ فرض نبھانے پیندے نیں
کجھ قرض وی لانے پیندے نیں
کدی آپ وی رُسنا پیندا اے
کدی یار منانے پیندے نیں

....

مشاعرہ بہت اچھا تھا۔ سامعین نے دل کھول کر داد دی اور بعد میں سب ایک دوسرے

سے مل کر تعریف کرتے رہے۔

سورج اپنا منہ چھپا رہا تھا۔ گرمی کا زور کم ہو گیا تھا۔ شام کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ آج پھر ٹیگور تھیٹر میں ڈرامہ دیکھنے جانا تھا۔ مدیحہ گوہر کی ڈائریکشن میں ڈرامہ ''بلھا'' تیار کیا گیا تھا۔ اس کی موسیقی مشہور موسیقار میاں شہریار نے ترتیب دی تھی۔ تحریر شاہد ندیم کی تھی۔ ''بلھا'' لاہور کے الحمرا ہال میں بھی کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے لیکن ہم نے پہلی بار یہاں اس کو دیکھا۔ عاصم بخاری ''بلھا'' کے کردار میں اس قدر جچ رہے تھے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ پورا اسٹیج ان کے نورانی چہرے کے عکس سے نورانی ہو رہا تھا۔ ایک عجب طرح کا کیف تھا۔ تمام کرداروں نے بھرپور اداکاری کی۔ بے حد لطف آیا اور غیر آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر جو بے چینی اور بے کیفی ہو رہی تھی اس کا ذرا برابر احساس نہیں ہوا۔

ڈرامے کے بعد پمی بائی کے لوک گیتوں کا مظاہرہ تھا۔ لوک گیتوں اور رقص کا یہ پروگرام سامعین پر وجد طاری کر رہا تھا۔ مقامی لوگوں نے اُٹھ کر ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ کچھ پاکستانی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ فن کاروں کو ان کے فن پر بھرپور داد ملی۔ محفل میں موجود بچے بھی سر اور تال کے ساتھ مست ہو رہے تھے۔

رات کا کھانا پنجاب بھون میں تھا۔ ہال سے باہر بسیں تیار کھڑی تھیں۔ تمام دن کی بھرپور مصروفیت کے باوجود سب لوگ خوشی خوشی اگلی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ پنجاب بھون کی کوئی بہت خوب صورت بلڈنگ نہ تھی۔ وہی سادگی اور تصنع سے پاک ماحول۔ ڈنر لان میں تھا۔ کچھ لائٹنگ کی گئی تھی۔ وسیع لان میں گول میزیں لگی تھیں جن کے گرد لوگ بیٹھے تھے۔

دیو سماج کالج کی پرنسپل اور ان کا سٹاف بھی وہاں موجود تھا۔ ہم سب خواتین بھی اسی میز کے گرد جا بیٹھیں۔ مقامی لوگوں میں خواتین کے ساتھ بچیاں بھی تھیں۔ دو بچیاں ہمارے قریب ہی بیٹھی تھیں اور پاکستانی مہمان خواتین سے بے حد خوش ہو کر مل رہی تھیں۔ وہی شرم و حیا اور لجاؤ جو مشرق کا حسن ہے ان کے چہروں پر نظر آ رہا تھا۔ یہ بچیاں شلوار قمیض میں ملبوس تھیں۔ پوچھنے پر علم ہوا کہ یہ کالج کی طالبات ہیں اور پاکستانی شاعرات سے ملنے کا اشتیاق ان کو یہاں کھینچ

لایا ہے۔ ان کے نام کے آگے بھی پریت کا لفظ تھا۔ پہلے ہمیں جب پریت ملی تھیں یہ کرم پریت اور من پریت تھیں۔ نیلما نے ایک لڑکی سے پوچھا کیا بات ہے یہاں ساری لڑکیاں پریتی ہیں؟ انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا کہ اکثر لڑکیوں کے گھریلوں نام پریتی ہی ہوتے ہیں۔ وہ لڑکیاں میرے قریب بیٹھی رہیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر سوال پوچھتی رہیں۔ انہیں یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ میں دس اُردو شاعری کی کتب کی اور پانچ تحقیقی کتب کی مصنفہ ہوں۔ اور جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں سرکاری ملازم بھی ہوں اور ایک اہم عہدے پر فائز ہوں اور اس کے ساتھ سوشل ورک اور ایک ادبی تنظیم بھی چلاتی ہوں۔ آپ اتنے سارے کام کیسے کر لیتی ہیں؟ وہ گویا ہوئیں۔ اب وہ میری پنجابی شاعری کے بارے میں جاننے کو بے قرار تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ بے شک میری پنجابی شاعری اُردو شاعری کے مقابلے میں کم ہے مگر پاکستان جا کر انشاء اللہ گورمکھی سکرپٹ کے ساتھ میری پنجابی کتاب ''عشق دا دیوا'' منظر عام پر آ جائے گی۔ ہمیں کتاب ضرور بھجوائیں۔ انہوں نے اصرار کیا اور ایڈریس کے تبادلے ہوئے۔ دیو سماج کالج کی پرنسپل کے گلے میں بشریٰ اعجاز بانہیں ڈالے بیٹھی تھیں۔ سب لوگ آپس میں گھل مل گئے تھے۔ محبتیں لنڈھائی جا رہی تھیں۔ گرم جوشی اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ہم مدتوں سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ میرا جی چاہا کہ اس بلڈنگ کو اندر سے بھی جا کر دیکھوں۔ میں اندر گئی۔ انتہائی سادگی سے آراستہ عمارت۔ کہیں کہیں پرانے صوفے پڑے ہوئے۔ چند ایک تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں۔ صفائی کا بھی کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ ہم باہر آ گئے۔ کھانا تیار تھا۔ روز کی طرح سبزی پنیر اور چکن سے بنے ہوئے انواع و اقسام کے کھانے ہمارے منتظر تھے۔ اچار اور سلاد کھانے کا لطف دوبالا کر رہے تھے۔ یہاں پان کا بھی سٹال تھا جہاں بنارس کے پان دیئے جا رہے تھے۔ ایسے مزیدار پان جو منہ میں ڈالتے ہی گھل جاتے تھے۔ ہم نے دو تین پان کھائے اور لطف اندوز ہوئے۔ ان لوگوں کی سادگی، سادہ پن، سادہ رہائش، سادہ اور پُروقار طریقہ متاثر کن تھا۔ خوش گوار لمحات کی خوش گوار یادوں کے ساتھ ہم واپس پلٹ آئے۔ یہ ڈنر مشرقی پنجاب کے صوبائی وزیر جنگلات اور رجندر سنگھ باجوہ نے وزیر اعلیٰ پنجاب کی طرف سے دیا۔

ہوٹل پہنچنے پر استقبالہ پر نیلما کے لیے ایک پیغام تھا۔ ایک لڑکی جو گِدے کی ماہر ہے اس کا نام رمنیک کور ہے۔ اس کا تعلق امرتسر سے ہے۔ اس نے اخبارات میں نیلما کی تصاویر دیکھی تھیں۔ یہ پاکستان میں اپنی کالج کی استاد پروفیسر ٹوانہ کے ساتھ لاہور آئی تھیں۔ وہیں اس کی ملاقات نیلما سے ہوئی۔ اب وہ نیلما سے ملنے کو بے تاب تھی۔ کل صبح وہ نیلما سے ملنے چندی گڑھ آرہی تھی۔ نیلما نے مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ اس کا نک نیم مونا ہے۔ وہ اسے بے حد پیار کرتی ہے۔ اکثر پاکستان میں بھی اس سے رابطہ کرتی ہے۔ نیلما اس کے آنے کے پیغام سے بے حد خوش تھی۔ گھر فون کرنا چاہتے تھے۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ ہوٹل سے فون مہنگا تھا۔ PCO جانے کا وقت نہیں تھا۔ تصور میں بچوں سے ملاقات کی، کھڑکی کا پردہ سرکا کر رات کی تاریکی کو محسوس کیا، نماز پڑھی، دعا مانگی اور تھکن سے چور ہونے کی وجہ سے پتہ ہی نہیں چلا کب نیند نے آلیا۔ آنکھ کھلی تو چار بجے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ روشنی میں شوالک ہوٹل کے گرد لگے ہوئے قد آور درختوں کے لمبے سائے نظر آرہے تھے۔ میں پاکستان میں صبح اس وقت نماز پڑھ کر باہر نکل جاتی ہوں۔ میری واک کی ساتھی بھی اُٹھ بیٹھی ہوں گی اور نماز کی تیاری کر رہی ہوں گی۔ اس کے بعد وہ اکیلی واک کریں گی اور مجھے یاد کریں گی۔ تھکن ابھی تک باقی تھی۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا اور نماز ادا کی۔

کل بہت سے اخباری صحافیوں نے انٹرویو لینے تھے۔ وندھنا جو انڈیا ٹائمز کی رپورٹر ہیں، ان کے ساتھ بھی تصویریں بنی تھیں۔ نیلما اُٹھ گئیں تو ہم دونوں نیچے اُتر آئے۔ ہال میں فخر زمان نے مجھے اخبار دیا جس میں ایس ایس نور کے ساتھ میری تصویر پہلے صفحہ پر تھی۔ اندر نیلما کا انٹرویو تھا اور ہماری تصاویر تھیں۔ آج آخری دن تھا اور کوریج بعد تک آئی تھی۔ اس اخبار کو سنبھال لیا۔ ناصر بشیر نے ایک اور اخبار دیا جس میں ہماری تصاویر تھیں۔ آج ناشتے میں پوریوں کی بجائے پراٹھے تھے۔ گرما گرم چائے کافی اور مزیدار ناشتے سے لطف اندوز ہوئے اور اخبار پڑھتے رہے۔ مجھے ہمیشہ تمام دن کے کھانوں میں صبح کا ناشتہ بے حد پسند ہے اور میں پوری طرف لطف اندوز ہوتی ہوں۔ کیوں کہ سیشن اور ناشتے کے درمیان کافی وقت ہوتا تھا اس لیے آرام سے ناشتہ کر کے

ہم اوپر جاتے تھے۔ نیچے سب لوگوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور غیر رسمی گفت گو بھی۔ PCO برابر کی بلڈنگ میں تھا۔ وہاں شاپنگ سنٹر بھی تھا۔ وہاں گئے تو علم ہوا کہ ابھی سینٹر بند ہے، گیارہ بجے کے بعد کھلے گا۔ آج دیو سماج کالج کی کانووکیشن پر بھی جانا تھا جہاں فخر زمان کی صدارت اور میں اور نیلما مہمان خصوصی تھے۔ گیارہ بجے جا کر کچھ یادداشتیں جمع کر کے لکھیں کیوں کہ سیشن ہونے میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔ نیچے آئے تو مشرقی پنجاب کے وزیر ہرنام داس جوہر کے ساتھ ہماری تصویر اخبار میں نظر آئی۔ یہ اخبار ہم نے ہوٹل کے کاؤنٹر سے ریکارڈ کے لیے حاصل کر لیا۔

30 مئی 2004ء کو تیسرے اور آخری دن کا اکیڈیمک سیشن گیارہ بجے شروع ہوا۔ اس سیشن کا موضوع پنجابی زبان اور سیاست تھا۔ اس سیشن کی صدارت پنجاب یونی ورسٹی چندی گڑھ کے پنجابی شعبہ کے سرجشت سنگھ نے کی۔ ڈاکٹر جوگا سنگھ پنجابی یونی ورسٹی پٹیالہ نے امن اور تعاون کے حوالے سے گفت گو کرتے ہوئے کہا کہ جنگ کا وقت گزر گیا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں صرف غلط فہمیوں نے ان کے ذہنوں کو اُلجھا رکھا ہے۔ ایک دوسرے سے تعلقات بڑھانے سے ملنے جلنے سے تعاون سے ذہن صاف ہوں گے۔ میں شیخوپورہ کے گاؤں باندودکا رہنے والا ہوں۔ ابھی تک بچپن کی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ میں بچپن کو بھلا نہیں سکا۔ اپنی جنم بھومی کو دیکھنے کی خواہش مجھے مرنے نہیں دیتی۔

ڈاکٹر محمد انیس عالم ڈائریکٹر اور ڈین آف علی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن لاہور فزکس کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں شرح خواندگی بے حد کم ہے۔ جب تک اسے نہیں بڑھایا جاتا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ شرح خواندگی کے لیے پرائمری سطح پر مادری زبان میں تعلیم کا ہونا شرط ہے۔ جب تک ایسا نہیں کریں گے ہم ذہنی طور پر کم زور رہیں گے۔

ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد صدر شعبہ پنجابی پنجاب یونی ورسٹی لاہور نے ایک تحقیقی مقالہ ''شعبہ پنجاب کا تحقیقی کام'' پیش کیا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالوں کو بھارتی یونی ورسٹیوں کے مقابلے میں زیادہ معیاری قرار دیا۔ انہوں نے یہ بات بھارتی ماہر تعلیم

کے حوالے سے ثابت کی کہ بھارت میں مقالوں کی تعداد بے شک زیادہ ہے لیکن معیار میں پاکستانی تحقیقی مقالے بہتر ہیں۔

پاکستانی شاعرہ بشریٰ اعجاز نے لوک داستانیں اور ''پنجاب کی عورت'' کے عنوان سے اپنا مضمون پڑھا اور کہا کہ رومانوی لوک داستانوں میں ہیر اور سسی بڑے جان دار کردار ادا کرتی ہیں جو اپنی شناخت اور حقوق کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے نظر آتے تھے۔ آج کی عورت کی زندگی اسی جدوجہد سے عبارت ہے۔ آج کی عورت میں اپنی ذات کی شناخت کے لیے نئی سوچ دَر آئی ہے۔ عورت بیدار ہوگئی ہے، وہ اپنے آپ کو منوانا جانتی ہے۔ بشریٰ کی تحریر اور اندازِ بیان بے حد خوب صورت تھا۔ جملوں میں استعمال کیے گئے الفاظ بیان کی خوب صورتی میں اضافہ کرر ہے تھے۔ ان کے اس مقالے کو بے حد سراہا گیا اور خواتین ایک دفعہ پھر بازی لے گئیں۔

پروفیسر سرجیت سنگھ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پنجابی زبان کو صرف پڑھائی تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ زبان کا تعلق لوگوں کی پہچان ان کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی خودمختاری سے ہوتا ہے۔ جس قوم کو گرانا ہو اس کی زبان کو گرانا ضروری ہے۔ زبان کا سب سے زیادہ تحقیقی استعمال بچے اور شاعر کرتے ہیں۔ اس اکیڈیمک سیشن کے ساتھ ہی کانفرنس کا اختتامی اجلاس کرنے کا فیصلہ ہوا۔ کانفرنس کے اختتامی اجلاس کی صدارت فخر زمان چیئرمین ورلڈ پنجابی کانگریس نے کی۔ سب سے پہلے فخر زمان نے پانچ کتابوں کو ریلیز کیا۔ یہ پانچ کتابیں کشمیری لال ذاکر کی کہانیوں کی کتاب ''سمندری ہواؤں کا موسم'' شائستہ حبیب کی پنجابی شاعری ''میں کپاہ تے چاننی'' راجندر کور کی طویل نظم ''کب ملو گے'' یونی سٹار پرکاوش کی سونیا گاندھی اور عالمی پنجابی کانفرنس لاہور 2001ء کی رپورٹ اور مکمل کاروائی۔ کتابوں کی ریلیز کے بعد ڈاکٹر دیپک من موہن نے 28 سے 30 مئی 2004ء تین روزہ عالمی پنجابی کانفرنس کا اعلان نامہ پیش کیا جس کا متن یہ تھا:

''ورلڈ پنجابی کانگریس کی منعقدہ دسویں عالمی پنجابی کانفرنس چنڈی گڑھ اس بات پر خوشی محسوس کرتی ہے کہ دونوں پنجابوں اور دوسرے

ملکوں سے آئے ہوئے پنجابیوں نے اس میں بڑے شوق سے، بڑی تعداد میں شرکت کی۔ پہلی کانفرنسوں کے اعلان ناموں کو تسلیم کرتے ہوئے اس کانفرنس کے اعلان نامے میں ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت دونوں پائیدار امن قائم کریں۔ ثقافتی تعاون پیدا کرنے کے لیے پنجابیوں کو عام اور آزادانہ طور پر ملنے کی سہولت پیدا کرنے کے لیے سارک ملکوں کے درمیان ویزا ختم کیا جائے یا پھر ملٹی پل ویزہ ہو۔

تجارت کا آسان ماحول پیدا کیا جائے تاکہ دونوں دیشوں کو فائدہ ہو اور وہ بڑی طاقتوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہ سکیں۔ دونوں ملکوں میں تعلیم و تحقیق کے مشترکہ پراجیکٹ بنائے جائیں۔ طالب علموں اور محققوں کو ایک دوسرے کی یونی ورسٹیوں میں داخلے کی اجازت دی جائے۔

دونوں ملکوں میں شاہ مکھی اور گورمکھی دونوں رسم الخطوں کو پڑھانے کا معقول بندوبست کیا جائے۔ آرٹسٹ، سنگیت کار، لکھاری، تھیٹر کے فن کار، ڈائریکٹر اور دوسرے لوگوں کو ایک دوسرے سے آزادانہ ملنے اور مشترکہ پروگرام کرنے کی اجازت ہو۔ اس سیشن میں وزیراعلیٰ پنجاب کی آمد متوقع تھی مگر بوجوہ وہ نہ آسکے۔"

مزید کہا گیا کہ:

"پاکستان میں جو انسٹی ٹیوٹ آف پنجابی لینگویجز بنایا جارہا ہے اور جہاں پنجابی ترقی دینے کے لیے مختلف کوششیں کی جارہی ہیں یہ کانفرنس ان کو سراہتے ہوئے یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ پنجابی ترقی کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو ختم کیا جائے۔ اپنے اس اعلان نامے میں کانفرنس یہ بھی اعلان کرتی ہے کہ ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں ملکوں کے

درمیان ڈاک کی سہولتوں کو اور زیادہ بڑھایا جائے اور ہمیں ایک دوسرے کی کتابیں اور رسائل جلد ملنے چاہئیں۔ ہم عالمی پنجابی کانفرنس کے تمام فیصلوں کو کامیاب بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں جس میں بعد میں توسیع کی جا سکتی ہے۔"

اس اعلان نامے کی منظوری کے بعد چند قرار دادیں پیش کی گئیں جنہیں متفقہ طور پر کانفرنس میں منظور کیا گیا جیسے کہ دونوں ملکوں کے درمیان سمجھوتہ ایکسپریس کا نام بدل کر دوستی ایکسپریس رکھا جائے۔ کیوں کہ سمجھوتہ لفظ میں ایک مجبوری پائی جاتی ہے جب کہ دوستی لفظ پیار، محبت، امن کی علامت ہے۔ دوسری اہم قرارداد میں کہا گیا کہ دونوں ممالک ایسے قدم اُٹھائیں جس کے ساتھ پنجابی، شاہ مکھی، گورمکھی کا عصری ادب دونوں ملکوں کے تعلیمی نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ طالب علم اپنے مشترکہ ثقافتی ورثے سے متعارف ہوں۔ اس قرارداد میں یہ بھی شامل کیا گیا کہ گورمکھی سے شاہ مکھی رسم الخط تبدیل کرنے والے سافٹ ویئر کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے۔

چیئرمین فخر زمان نے کانفرنس کے ان فیصلوں اور مطالبوں کو نافذ کرنے اور اس میں رد و بدل کرنے کے لیے کمیٹیاں بنانے کا اعلان کیا جس کی رو سے انڈین چیئر کے لیے اوتار سنگھ پال، ڈاکٹر دیپک من موہن، ڈاکٹر سندر سنگھ نور جب کہ پاکستان سے افضل احسن رندھاوا، پروین عاطف، غلام محی الدین، اعزاز احمد آذر کے نام شامل ہیں۔ اس موقع پر فخر زمان نے ورلڈ پنجابی کانگریس کے الگ الگ ونگ بنانے کا بھی اعلان کیا۔

سیشن کے اختتام کے بعد ٹیگور ہال میں بھی پروگرام تھا اور دیو سماج کالج بھی جانا تھا۔ اس سے قبل پاکستان فون کرنا چاہتے تھے۔ شری رام صاحب نے مہربانی فرمائی اور اپنی گاڑی میں مجھے، نیلما اور رخشندہ اور صدف کو پی سی او لے کر گئے۔ دو پی سی او بند تھے۔ کافی دُور جا کر ایک پی سی او ملا۔ ہم سب نے گھر بات کی، اپنی خیریت بتائی اور گھر والوں کی خیریت معلوم کی۔ کال سستی ہونے پر بے پناہ تعجب تھا۔ پی سی او تک پہنچنا مشکل ہوتا تھا ورنہ دن میں دو تین بار آسانی سے

پاکستان بات ہو سکتی تھی۔ شام کے کلچرل پروگرام میں پاکستانی اور بھارتی پنجاب کے لوک فن کاروں نے گیت اور سنگیت کی محفل ٹیگور ہال میں ہونی تھی۔ اس میں روزینہ کوثر پنجابی کی لوک گلوکارہ سریندر کور کی بیٹی ڈولی گلبریہ کے علاوہ پرم جیت سندھو، ستر ندرخ کنول پریت کے علاوہ پناز ریں سلمان نے حصہ لیا تھا۔

کالج کی گاڑی اور سٹاف مجھے اور نیلما کو لینے آ گئے تھے۔ رخشندہ بھی ہمارے ساتھ گئیں۔ صغریٰ صدف حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر گئی تھیں۔ بشریٰ اعجاز اور پروین عاطف شملے کے لیے روانہ ہو چکی تھیں۔ رمنیک کور بھی امرتسر سے آ گئی تھی وہ ہمارے ہی کمرے میں ٹھہری تھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کالج کے فنکشن میں جا رہی تھی۔ ایک بار پھر شاندار استقبال کیا گیا۔ پھولوں کی بارش اور سوندھی سوندھی خوشبو اور ٹھنڈک ان کی محبتوں کا احساس دلا رہی تھی۔ فخر زمان بھی تشریف لا چکے تھے۔ آج طالبات کو ان کے تعلیمی سیشن ختم کرنے پر ڈگریاں ملتی تھیں۔ طالبات کالے گاؤن میں ملبوس بہت خوش و خرم نظر آ رہی تھیں۔ رنگ و خوشبو سے ہال مہک رہا تھا۔

کچھ طالبات نے ہاتھ میں چوڑا پہنا ہوا تھا۔ بہت سی رنگین، خوب صورت چوڑیاں۔ رمنیک نے بتایا کہ جن لڑکیوں کے ہاتھ میں چوڑا ہے ان کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے اور یہ شگنوں کا چوڑا ہے۔ طالبات قمیض شلوار کے علاوہ ساڑھیوں میں بھی ملبوس تھیں۔ لمبی لمبی قطاریں بنی ہوئی تھیں کیوں کہ کئی سیشن کی طالبات کو ڈگریاں ملتی تھیں۔ اس مرحلے میں دن تین گھنٹے لگ گئے۔ درمیان میں ورائٹی پروگرام بھی ہوتا رہا۔ پروگرام کے آخر میں میرا اور نیلما کا بھی بطور مہمانِ خصوصی تعارف کروایا گیا اور ہمیں تحفے کے طور پر دودھ بلوتی پنجابن کی شیلڈیں دی گئیں، ان پر ہمارا نام کندہ تھا۔ رخشندہ کا نام ان کی شیلڈوں میں نہیں تھا لیکن انہوں نے اس کو بھی اعزاز بخشا اور شیلڈ دی۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ فنکشن کے بعد وہ ہمیں چائے پر روک رہی تھیں مگر ہمیں ڈنر کے لیے جانا تھا۔ ہم نے ان کی خلوص اور محبت کو سراہتے ہوئے شکریہ ادا کر کے وزٹنگ کارڈز کا تبادلہ کر کے ان سے اجازت چاہی۔

رات کو ٹیگور تھیٹر میں چنڈی گڑھ کی سکھی (سکھبیر کور) اور لاہور کی گلوکارہ روزینہ کوثر

اور پنّا نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ روزینہ نے ہیر رانجھا فلم کا گانا ''سن ونجلی دی مٹھری تان'' سنایا جسے چنڈی گڑھ کے لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ اور پھر اس نے فرمائش پر ''لٹھے دی چادر'' سنایا۔ سریندر کور کا یہ گانا روزینہ کوثر کی آواز میں سُن کر وہاں موجود خواتین نے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ ایک خاتون نے تو اسٹیج پر آ کر اس کے ساتھ آواز میں آواز ملائی۔ آخر میں روزینہ کوثر نے نور جہاں کا گانا ''میرے دل دے شیشے وِچ سجنا'' سنایا۔ یہ قدرے مشکل گیت ہے لیکن روزینہ اس کو نبھا گئی۔ سکھ عورتوں نے اسٹیج سے نیچے آنے پر نہ صرف دل کھول کر اس کو داد دی بلکہ اس کا ماتھا چومنے لگیں۔ اس شہر میں اپنی پاکستانی آرٹسٹ کی اس قدر پذیرائی دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

رات کے کھانے کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑیاں ایک جگہ جا کر رُکیں تو بتایا گیا کہ یہ صوبہ ہریانہ کا ایک شہر پنجور ہے۔ وزیر اعلیٰ مسٹر اوم پرکاش چونالہ ہمارے میزبان ہیں۔ مغلیہ طرز پر بنا ہوا یہ باغ شالیمار باغ سے ملتا جلتا تھا۔ نام تھا یادوندر گارڈن۔ یہاں وزیر اعلیٰ اپنی تمام کابینہ اور مشینری کے ساتھ موجود تھے۔ کلچرل شو کا بھی انتظام تھا۔ باغ میں فوارے چل رہے تھے۔ نقرئی بلبوں سے اطراف کو سجایا گیا تھا۔ ڈسپلن یہاں بھی تھا۔ کوئی ہڑبونگ نہیں تھی۔ فواروں کے سامنے سیدھی رو میں لائنوں میں کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ سامنے کلچر شو کے لیے اسٹیج بنایا گیا تھا۔ ہمارے دائیں طرف اس کا دوسرا تختہ تھا جہاں فوارے چل رہے تھے۔ ہم فواروں کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے کلچرل شو ہو رہا تھا۔ مقامی فن کاروں نے گیت سنائے۔ رقص کے مختلف انداز دیکھنے کو ملے۔ ایک چھوٹے سے بچے نے خٹک ڈانس کا مظاہرہ کیا۔ لاہور کی روزینہ کوثر اور زریں پنّا نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد حاصل کی۔ اسلامی اور غیر اسلامی مشروبات گردش میں تھے۔ اسنیکس سے بھی تواضع کی جا رہی تھی۔ آج مجمع کافی بڑا تھا۔ کل کے ڈنر میں ملنے والی طالبات آج آٹو گراف بکس لے کر آئی تھیں۔ ان کو انگریزی میں آٹو گرافس دیئے کیوں کہ ہندی اور گورمکھی ہم نہیں جانتے تھے اور اردو وہ نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ بچیاں گلے میں بانہیں ڈال کر اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کی محبت نے احساس دلایا کہ اسلحے کے ڈھیر سے امن قائم نہیں ہوتا۔ انفرادی محبتیں بھی پورا منظر نامہ

تبدیل کر سکتی ہیں۔ مدیحہ گوہر کے اجوکا تھیٹر کے گروپ کے ارکان بھی نظر آ رہے تھے۔ کھانا حسب روایت بہت لذیذ تھا۔ پان بھی تھے اور مشروب مشرق و مغرب بھی۔ پاکستانی مندوبین میں سے بھی کئی اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خوب صورت باغ، چاندنی رات، فواروں کی ترنم ریزی بھلی لگ رہی تھی۔ باہر بسیں تیار کھڑی تھیں۔ نیلما حسب عادت بس چلتے ہی خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئیں۔ ہوٹل پہنچے تو اوم پرکاش چٹیالہ وزیر اعلیٰ ہریانہ کی طرف سے تحائف موجود تھے۔ صبح دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر ہی اعزاز اسلم نے اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ دہلی جانا چاہتے ہیں اپنے نام لکھوا دیں۔ ہم سوچ رہے تھے صبح چندی گڑھ کو چھوڑ دینا ہے جو یہاں کا خوب صورت شہر ہے، جس کے 24 سیکٹر ہیں۔ ہر سیکٹر ایک مربع کلومیٹر کے رقبہ پر مشتمل ہے۔ اب یہ شہر 52 سیکٹروں پر پھیل چکا ہے۔ سیکٹر 22 میں واقع شیوالک ہوٹل ہے، اس کے سامنے بھی درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ہمارے سامنے سڑک کا ٹوٹا ہوا فٹ پاتھ بھی نظر آ رہا تھا۔ بہر حال یہ ہمارے جیسے ممالک کا المیہ ہے۔ شاید وہ بھی اس کے لیے اگلے بجٹ کے منتظر ہوں گے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں یہاں کے لوگوں کی محبتوں کی گرمی اپنے اندر محسوس کر رہی تھی۔ یہ محبتیں، یہ خلوص مجھے امن کی نوید دے رہے تھے۔ اب فیصلہ بندوق کی گولی سے نہیں ہوگا، گلے ملنے سے ہوگا۔ یہ لطیف احساس مجھے سرشار کر رہا تھا۔ تھکن سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، دماغ جاگ رہا تھا۔ صبح آٹھ بجے کا کہا گیا تھا اور مجھے عادتاً چار بجے اُٹھنا تھا۔ نہ جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔ نو بجے کمرہ چھوڑ کر نیچے اُتر آئے۔ اب اراکین وفد کی منزلیں الگ الگ تھیں۔ کچھ لوگ شملہ جا رہے تھے، کچھ فخر زمان کے ساتھ واہگہ بارڈر کی طرف جانا چاہتے تھے۔ فخر زمان شائستہ کی وجہ سے اب زیادہ دیر ہمارے ساتھ رُک نہیں سکتے تھے۔ ایک بڑا گروپ دہلی کے لیے تیار تھا۔ فخر زمان نے تمام اراکین کو الوداع کہہ کر روانہ ہونا تھا۔ یہ ان کا احساسِ ذمہ داری اور Commitment کا جذبہ تھا۔ گیارہ بجے کی بسیں تین بجے روانہ ہوئیں۔ بسوں کے آگے ایک پولیس کی جیپ بھی تھی جس نے پٹیالہ کی حدود تک ساتھ جانا تھا۔ اس کی وجہ سے بار بار رُکنا بھی پڑا۔ سفر طویل تھا اور مندوبین تھک بھی چکے تھے۔ اکثر لوگ سو گئے تھے اور کچھ ہمارے جیسے، جن کے ذہن جاگتے

رہتے ہیں، اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔

چندی گڑھ سے جی ٹی روڈ کو ملانے والی سڑک قدرے پتلی ہے۔ اس لیے رفتار ذرا کم رہی۔ چندی گڑھ سے دہلی کا فاصلہ تین سو کلو میٹر ہے۔ کہتے ہیں کار سے یہ فاصلہ تین چار گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے بسیں ذرا زیادہ ٹائم لیتی ہیں۔ مگر ہم نے یہ سفر چھ یا ساڑھے چھ گھنٹے میں طے کیا۔ لیکن سفر کا آغاز تو صبح نو بجے سے ہو چکا تھا جب ہم روانگی کے لیے نیچے اُتر آئے تھے۔ پہلے پروگرام یہ تھا کہ کھانے کے لیے کوروکیشتر میں روکا جائے گا جہاں ایک میوزیم بھی ہے لیکن تاخیر سے روانگی کی وجہ سے یہ پروگرام ڈراپ کرنا پڑا۔ راستے میں ایک ہوٹل سرراہ ہے جسے یہ لوگ ڈھابہ کہتے ہیں ہمیں کھانے کے لیے رُکنا پڑا۔ ڈھابے والے اتنے بڑے گروپ کے لیے کھانے کے انتظام میں دقت محسوس کرر ہے تھے۔ ایک افراتفری سی تھی۔ کچھ لوگوں کو کھانا مل گیا، کچھ نے اسنیکس اور چائے پر اکتفا کیا۔ میں نے شوگر کی دوا لینی ہوتی ہے تو کچھ کھانا ضروری ہو جاتا ہے۔ بہ مشکل ذرا سی دال اور روٹی دستیاب ہوئی۔ چائے میٹھی تھی وہ میں لے نہیں سکتی تھی۔ سب نے حسب خواہش کچھ نہ کچھ لیا اور بسیں آگے روانہ ہو گئیں۔ ہمارے راستے میں وہ مقامات آئے جہاں سے دہلی جانے والا ہر لشکر اور ہر فاتح گزرا۔ پانی پت کے میدان کے قریب سے بھی گزرے اور تاریخ میں پڑھی ہوئی پانی پت کی جنگ کا منظر نامہ سامنے آ گیا۔ پانی پت کے ایک میدان کا نام کروکیشتر بھی ہے جہاں مہا بھارت ہوئی۔ مہا بھارت دنیا کی عظیم رزمیوں میں شامل ہے۔ اسی جنگ کے دوران کرشن مہاراج نے وہ مشہور واعظ کیا جسے بھگوت گیتا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کا شمار اعلیٰ مذہبی اور اخلاقی ادب میں ہوتا ہے۔ سفر طے ہوتا جا رہا تھا۔ سبزہ، درخت، میدان ہمارے ساتھ بھاگ رہے تھے اور ہم دوڑ کر یہاں سے گزر جانا چاہتے تھے۔ اب گورمکھی کی بجائے دیواروں پر ہندی رسم الخط نظر آ رہا تھا۔ انگریزی میں بھی کئی بورڈ اور اشتہار آویزاں تھے۔

بہر حال کرنال اور روہتک کے حصار سے ہوتے ہوئے ہم دہلی کی حدود میں داخل ہوئے۔ لاہور کے مضافات کی طرح کچی بستیاں، جھونپڑیاں، سڑکوں پر کوڑا کرکٹ، سڑکیں ٹوٹی ہوئی، بنتی ہوئی۔ جا بجا میٹریل بکھرا ہوا۔ ہم دریائے جمنا کے پل پر سے گزر رہے تھے۔ سڑک کے

ایک طرف بنا ہوا بہت بڑا باغ گاندھی گارڈن بھی نظر سے گزرا۔ اتفاق سے میرے پاس اس وقت کاغذ قلم موجود نہ تھا تو نوٹس میں مکمل نہ کر سکی۔ ذہنی یادداشتوں پر گزارا کر رہی ہوں۔ پروفیسر احسان اکبر صاحب نوٹس لے رہے تھے۔ ان سے کہا تھا کہ مجھے بھی یہ بھجوائیں مگر ان سے یہ نوٹس مل نہیں سکے۔ ہمیں پنجاب بھون جانا تھا جہاں ہمارے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ ڈرائیور کو راستہ نہیں آتا تھا، بار بار پوچھنا پڑ رہا تھا۔ ہم نے شہر کو بس میں گھوم کر دیکھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ ایک بڑی سڑک جہاں ٹریفک بھی قدرکم تھا پنجاب بھون کی بلڈنگ نظر آئی۔ یہ دُوردَرشن کی بلڈنگ کے ساتھ تھی۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا مجسمہ لان میں ایستادہ نظر آیا۔ یہ سردار بیلہ سنگھ کا مجسمہ ہے جسے ایک دن کے لیے دہلی کی حکومت ملی تھی۔

ہمارے ساتھ روانہ ہونے والے اور بسیں پہنچ چکی تھیں۔ ہم بھی اندر جا کر ایک Reception Room میں داخل ہو گئے۔ تا کہ معلومات حاصل کر سکیں۔ اب قافلہ سالار اعزاز احمد آذر تھے۔ ایک ساتھی بیمار ہو گئے۔ ان کو فوری طور پر ہسپتال داخل کروا دیا گیا۔ کچھ تو باعث پریشانی ان کی بیماری تھی اور ایک نئی پریشان کن صورت حال جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ انہیں ہمارے آنے کی اطلاع تو تھی مگر یہ طے نہیں پایا تھا کہ کمروں کا کرایہ کون ادا کرے گا۔ آذر صاحب معاملہ طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر یہ طے پایا کہ ایک کمرے کا کرایہ فی دن آٹھ سو روپے ہے، اگر ایک کمرے میں چار چار لوگ ٹھہر جائیں تو 200 روپے فی کس خرچہ ہوگا۔ پردیس میں ٹھکانہ کرنے اور رات گزارنے کے لیے مناسب رقم تھی۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔ کمرے الاٹ کر دیئے گئے۔ میں، نیلما، صغریٰ اور رخشندہ ایک کمرے میں ٹھہر گئے۔ ہمارے پاس صرف ایک دن تھا اور اس میں دہلی کی سیر اور تاریخی مقامات دیکھنے تھے۔ فوری طور پر کمرے میں جا کر تازہ دم ہو کر باہر نکلے، باہر سے کچھ معلومات حاصل کریں اور سب سے پہلے کرنسی تبدیل کروائیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ کناٹ پیلس ایک جگہ ہے جہاں سے شاپنگ بھی ہو سکتی ہے اور کرنسی بھی تبدیل کروائی جا سکتی ہے۔ پرانی دہلی چار دیواری کے اندر ایک قدیم شہر ہے جسے مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اس وقت آباد کیا جب اس نے 1650ء میں آگرہ سے اپنا دارالحکومت دہلی منتقل کیا۔ ہم اسی پرانی دہلی

میں رکشے میں بیٹھ کر گزر رہے تھے۔ شاہ جہاں کو عمارتیں بنانے کا بے حد شوق تھا اس لیے اس کو معمار بادشاہ بھی کہا گیا ہے۔ شاہ جہاں نے دہلی کو بے حد پرشکوہ بنانے اور اپنی شان وشوکت اور دبدبے کے لیے لال قلعہ بھی تعمیر کیا جسے ہم نے دیکھنا تھا۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ رکشہ کناٹ پیلس کے باہر رُک گیا۔ 40 روپے کرایہ طے پایا تھا، وہ ادا کیا۔ سامنے کناٹ پیلس تھا۔ یہ اسلام آباد کی Covered Market کی طرح ایک بازار ہے۔ چھت کے نیچے بازار ہے۔ سیڑھیاں اُتر کر اندر داخل ہو کر چیزوں کی قیمتیں معلوم کیں جو قدرے زیادہ تھیں لیکن فی الحال ہم منی چینجر کی تلاش میں تھے۔ دو تین گلیاں چھوڑ کے وڈیو شاپ کے ساتھ منی چینجر کی دکان تھی۔ موصوف نے کہا فون پر ریٹ پتہ کر کے بتاتا ہوں۔ پتہ چلا کہ 100 کے 40 روپے دیں گے جب کہ ہم نے واہگہ بارڈر پر 100 کے 70 روپے لیے تھے۔ کسی دوسری دکان کی تلاش کی کیوں کہ وہ تو ہمیں پردیسی سمجھ کر لوٹ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک اور دکان کا سراغ لگا۔ وہاں پر انہوں نے 60 ریٹ بتایا اور ہم پر مہربانی کر کے 65 پر راضی ہو گئے۔ یہ سودا بھی مناسب نہ تھا۔ رات ہوتی جا رہی تھی اور ابھی کچھ بھی کام نہیں ہوا تھا۔ کسی نے بتایا کہ جامع مسجد چلے جائیں وہاں مناسب رقم مل جائے گی۔ باہر نکل کر رکشہ کی تلاش ہوئی۔ راستے میں لال پتھروں سے چنی گئی دیواروں کے عقب میں لال قلعہ اپنی شوکت وعظمت دکھا رہا تھا اور رات کی روشنی میں اس کا جاہ و جلال مسحور کر رہا تھا۔ اس کا صدر دروازہ لاہوری گیٹ چاندنی چوک کی طرف کھلتا تھا۔ اب اس دروازے کے سامنے اس قدر گنجان آبادی ہے کہ تنگ اور بل دار گلیوں سے گزرنا محال ہے۔ رکشے نے ہمیں جامع مسجد سے کافی دُور باہر اُتار دیا۔ ہمیں پیدل چل کر جامع مسجد پہنچنا تھا۔ ہم چاروں خواتین تھیں۔ اجنبی دیس کہیں ہلکا سا خوف بھی تھا۔ راستے میں جگہ جگہ چیزوں کے سٹال لگے ہوئے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے پلاسٹک کے بنے ہوئے بڑے بڑے بیگ 40 روپے میں خریدے تاکہ شاپنگ کا سامان اس میں رکھا جا سکے۔ بلند پلیٹ فارم پر تعمیر شدہ مسجد میں داخل ہونے کے لیے درجنوں سیڑھیاں چڑھنا پڑیں۔ مسجد خوب صورت اور کشادہ تھی۔ جالیوں پر خوب صورت کام تھا جو غفلت زمانہ کی وجہ سے ماند پڑ رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر پلیٹ فارم پر آئے تو

کوڑے کرکٹ کے ڈھیر نے ہمارا استقبال کیا۔ جا بجا لیٹے بیٹھے فقیر عورتیں مرد بچے۔ دکانوں میں نعتوں کی کیسٹیں بلند آواز سے بجائی جا رہی تھیں۔ وعظ بھی جا رہی تھا۔ یہاں زیادہ تر مسلمان نظر آ رہے تھے۔ ہمیں جامع مسجد کے باہر ایسی کسمپرسی، گندگی اور بدبو سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ ہم نے پڑھا تھا کہ پرانی دہلی ایک زمانے میں جس چار دیواری کے اندر تعمیر ہوئی تھی اس کے چودہ داخلی دروازے تھے جو شام کو بند کر دیئے جاتے اور صبح مقررہ وقت پر کھول دیئے جاتے تھے۔ ہمیں خوف تھا کہ یہ دروازے بند نہ ہو جائیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اب کوئی ایسا سسٹم نہیں ہے۔ کوئی کسی بھی وقت شہر میں داخل ہو سکتا ہے۔ ابھی تک ہم کرنسی تبدیل نہیں کروا سکے تھے جب کہ ارادہ یہ تھا کہ نئی اور پرانی دہلی کے درمیان جو بلند دروازہ ہے جسے خونی دروازہ کہا جاتا ہے، دیکھیں گے۔ اس دروازے کے خونی کہلانے کی وجہ سے یہ ہے کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر، اس کے دو بیٹوں کو اس جگہ انگریزوں نے پھانسی دی۔ جب سے اس کا نام خونی دروازہ پڑ گیا۔ اس جگہ سے نئی دہلی کی حدود شروع ہوتی ہے۔ یہ انگریزوں نے بنائی تھی۔ ہم ابھی پرانی دہلی میں پھر رہے تھے۔ پرانی دہلی گنجان آباد ہے اس وجہ سے یہاں کی زمین بھی بے حد مہنگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب سبزے اور پارکوں کے لیے جگہ کی گنجائش کم ہوتی جا رہی ہے، پلوشن میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جب کہ نئی دہلی کشادہ ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہاں مُردوں کو جلانے کا بھی رواج ہے۔ اب جنگل ختم ہوتے جا رہے ہیں، ان کے لیے مسئلہ تو ہو گا۔ پچھلے دنوں نیٹ پر یہ انفارمیشن دیکھی کہ پلوشن کو بڑھنے سے بچانے کی خاطر اور لکڑی کی بچت کے پیش نظر مُردوں کو جلانے کی بجائے بجلی کے تنور میں ڈال دیا جاتا ہے کیوں کہ مرنے والے کے وزن کا تیس فی صد صندل کی لکڑی، باقی اکاش کی لکڑی کیوں کہ یہ جلنے میں اچھی ہے، اس کے ساتھ بیس کلو گھی ڈال کر مُردہ جلایا جاتا تھا۔ اب بچت اور فضائی آلودگی سے بچنے کے لیے الیکٹرانک سسٹم کو رائج کیا گیا ہے۔ میں چوں کہ آہستہ چل رہی تھی اس لیے سوچتی ہوئی پیچھے رہ گئی۔ میری ساتھی ایک لمبی گندی گلی کراس کر کے بازار میں داخل ہو رہی تھیں۔ میں نے انہیں آواز دے کر روکا تاکہ میں بھی ساتھ مل جاؤں اور بھٹک نہ جاؤں۔ باہر نکل کر ایک بورڈ نظر آیا، یہاں پرانے نوٹ تبدیل کیے جاتے ہیں اور کرنسی تبدیل کی

جاتی ہے۔ میز کی دوسری طرف ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اس نے 100 کے 75 کا بھاؤ بتایا۔ یہ مناسب تھا۔ سب نے کرنسی تبدیل کروائی۔ میرے پاس انڈین کرنسی تھی جو میں لاہور سے لائی تھی۔ احتیاطاً کچھ اور کرنسی بھی تبدیل کروائی۔ دوبارہ اسی راستے اندر داخل ہوئے کیوں کہ نیچے گلی میں بازار تھا۔ چاندنی چوک پہنچنا اس وقت مشکل تھا اس لیے نزدیکی بازار سے ہی شاپنگ کا شوق پورا کیا۔ انڈیا آئے تھے، لوگوں کے لیے تحائف لینا بہت ضروری تھی۔ کڑھائی والے دوپٹوں کی دکان نظر آئی۔ ہم چاروں نے مختلف رنگوں کے کڑھائی والے ڈھیر سارے دوپٹے خرید لیے۔ کچھ سوٹ خریدے اور باقی خریداری کل تک کے لیے منسوخ کردی۔ کسی نے کہا تھا کہ ہلدی رام کی کاجو والی برفی مشہور ہے وہ لانا۔ پتہ چلا یہ دکان چاندنی چوک میں ہے۔ اب بھوک بھی زوروں کی لگ رہی تھی۔ مین روڈ پر ہوٹل اور تندور وغیرہ تھے۔ وہاں پر نکل آئے۔ کولڈ ڈرنکس کے ساتھ دال روٹی لے کر کھائی۔ بہت سستا کھانا تھا۔ اب نیند کا بھی غلبہ تھا، واپس پہنچنے کی فکر تھی۔ رکشہ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی نے ایک چار دیواری کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں سے ٹیکسی مل جاتی ہے۔ مگر ٹیکسی والے سے کرایہ طے نہ ہوا۔ وہ غالباً سوا سو روپے مانگ رہا تھا۔ ہم نے رکشے میں جانے میں عافیت سمجھی۔ صد شکر کہ باہر آ کر رکشہ مل گیا اور ہم پنجاب بھون کی طرف روانہ ہوئے۔ رکشے والے کو پنجاب بھون کا علم نہیں تھا۔ بھٹکتے بھٹکاتے بڑی مشکل سے پنجاب بھون پہنچے۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ تھا، میٹرس بھی انہوں نے نہیں دیا۔ میں، رخشندہ اور صغریٰ صدف بیڈ پر سو گئے۔ نیلما نے کرسیاں جوڑ کر سونے کا فیصلہ کیا۔ تھکن بے حد تھی۔ نہ جانے کب نیند نے غلبہ پا لیا۔

میں حسب عادت سب سے پہلے بیدار ہوگئی اور نہا دھو کر تیار ہوگئی۔ طے یہ پایا تھا کہ صبح صبح دہلی کی سیر کو نکل جائیں گے کیوں کہ صرف آج شام تک کا ٹائم ہے۔ کافی جگہیں دیکھنی ہیں اور شاپنگ بھی کرنی ہے۔ آہستہ آہستہ صغریٰ، نیلما، رخشندہ سب تیار ہوگئیں اور ہم باہر نکل آئے۔ موسم صبح کے وقت زیادہ گرم نہیں تھا۔ ہم نے ہاتھوں میں کل خریدے ہوئے بڑے بڑے شاپنگ بیگ جن میں چند کتابیں تھیں اُٹھا رکھے تھے۔ پنجاب بھون کے گیٹ سے باہر آئے تو انقلاب کے

افضال طالب اور دن اخبار کے میاں حبیب بھی پیدل چل جا رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ تھوڑی ہی دُور ایک بڑا سا باغ نظر آیا۔ باغ کے بالکل سامنے پارلیمنٹ ہاؤس تھا۔ ہم نے باغ سے شارٹ کٹ کا ارادہ کیا۔ سامنے گیٹ آف انڈیا تھا۔ ہماری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ بہت شوق تھا گیٹ آف انڈیا دیکھنے کا۔ گیٹ آف انڈیا شہداء کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ اس کو قریب سے جا کر دیکھا، فوٹوگرافی کی اور پھر پیدل ہی یہ باغ کراس کر کے سڑک پر آ گئے۔ یہاں سے شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار کی بابت پوچھا، پتہ چلا کہ سڑک پار سے بس ملے گی جو حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار تک لے جائے گی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اس شہر میں مقبروں کے شمار کے لیے تو وقت درکار ہے اور ان کی تاریخی حیثیت پر مورخ مقالے تحریر کر سکتے ہیں۔ دہلی کے خواجگان کی تعداد بائیس بتائی جاتی ہے، ان سب میں سے سینئر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ہیں جو ولی الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی خلیفہ اور حضرت بابا گنج شکر فرید کے مرشد تھے۔ مگر عوامی مقبولیت کے لحاظ سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سرفہرست ہیں۔ آج ہمیں ان کے مزار شریف پر حاضری کی سعادت نصیب ہو رہی تھی۔ بس کے کنڈیکٹر نے ہمیں ہمارے لباس سے پہچان کر کہا کہ مسلمان ہیں اور درگاہ جانا چاہتے ہیں۔ راستے میں بہت سے لوگ نظر آئے جو ننگے پیر درگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ بس رُک گئی۔ یہ بستی نظام الدین اولیاء تھی، یہاں پہنچتے ہی ہمیں علاقے کی غربت سے اندازہ ہو گیا کہ ہم مسلمان علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد لاہور میں کاچھو پورہ، چونگی امر سدھو، داتا صاحب کا نزدیکی علاقہ وغیرہ ایسی بستیاں تھیں مگر اب ان کی حالت کافی بہتر ہے مگر ہزاروں سال گزرنے کے باوجود اس بستی کی حالت نہیں بدلی تھی۔ جب امراء یہاں حاضری کے لیے آیا کرتے تھے شاید اس دَور میں اس کی حالت کچھ بہتر ہو مگر اب تو ناگفتہ بہ تھی۔ ٹوٹی پھوٹی، تنگ، پُر پیچ، اونچی نیچی گلیاں، اطراف میں بنے ہوئے ہوٹل، تندور، پی سی او اور دیگر دکانیں۔ ہم چلتے جا رہے تھے درگاہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ ہمارے تصور میں ایک وسیع رقبہ، وسیع صحن والی درگاہ تھی کیوں کہ یہاں معتقدین کے ہجوم کے بارے میں سنا کرتے تھے۔ دروازے میں داخل ہونے کے بعد بھی درگاہ تک پہنچنے

میں ٹائم لگا۔ چھوٹا سا صحن جس میں اتنے عظیم بزرگ کی درگاہ تھی، ان کے سجادہ نشین صحن میں ٹہل رہے تھے اور چندہ ڈالنے کی درخواست کر رہے تھے۔ ہم ابھی تک اپنی حواس مجتمع نہیں کر پائے تھے۔ پہلے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ کیف حضوری سے سرشار تھے لیکن سجادہ نشین کی چندے کی تکرار اور فقیروں کی مسلسل فرمائش، رابطہ بحال نہیں ہونے دے رہی تھی۔ ہم بار بار تار جوڑتے اور سلسلہ منقطع ہوتا رہا۔ کچھ جانے کی بھی جلدی تھی۔ جس طرح ہم چاہتے تھے اس کیفیت سے گزر نہیں پائے۔ ہم تو خود اتنی دُور چل کر کچھ حاصل کرنے آئے تھے۔ ایک قلبی اور روحانی تعلق ہمیں یہاں تک لے آیا تھا۔ آزردہ سے ہو کر وہاں سے ملک الشعراء طوطی ہند امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے چل دیئے۔ امیر خسرو جو حضرت نظام الدین اولیاء کے عاشق تھے ان کے قریب ہی انہوں نے جگہ بنالی تھی۔ یہاں موجود فقیر ہمیں اپنا حال سنانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ سنا تھا کہ درگاہ کا صحن اتنا بڑا تھا کہ اس میں روزانہ ہزاروں لوگ سوتے تھے، اب تو شاید اس میں سو لوگ بہ مشکل سما سکیں۔ اگربتیوں اور گلاب کے پھولوں کی مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معتقدین چادریں اور چڑھاوے چڑھا رہے تھے۔ رش اس وقت کم تھا۔ ہم غیر مطمئن سے باہر نکل آئے۔

سنا تھا قریب ہی غالب کا مزار ہے اور غالب اکیڈیمی بھی۔ ادب کے طالب علم ایک روحانی عالم اور ایک استاد کے مزار کی زیارت کر آئے تھے۔ اب ہم انہیں ڈھونڈنے نکلے تھے جن کی بیاض بچپن سے ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔ بے شک ہر عمر میں نئے معنی پر کھلے اور ابھی تک یوں لگتا ہے کہ ہم پوری طرح اس کو سمجھ نہیں پائے۔ یہ عقیدت اور محبت ہمیں کشاں کشاں مزارِ غالب کی سمت لیے جا رہی تھی۔ رستے میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ یہیں سے شاپنگ کا آغاز ہو گیا۔ تسبیحیں، سوویز، انگوٹھیاں، لاکٹ خریدے جا رہے تھے۔ میں نے بھی چند انگوٹھیاں لیں۔ ایک تو مجھے غالب کے مزار پر پہنچنے کی جلدی تھی دوسرے بغیر ناشتے کے نکلے تھے۔ شوگر کی دوا لینی تھی۔ کچھ کھانا ضروری تھا۔ باہر نکلے تو تنور پر گرم نان لگ رہے تھے۔ وہ روکھے کھا کر دوا کھائی اور مزار غالب کی دہلیز پر جا پہنچے۔ یہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پھول ہم اندر مزاروں پر ڈال آئے تھے۔ کچھ اور

پھول قریب کی دکان سے خریدے۔ تالا کھلنے کی بابت پوچھا۔ پردیسی جان کر انہوں نے کہا تالا کھلوا دیتے ہیں ورنہ ہم سوچ رہے تھے کہ آج یہاں سے ایسے ہی واپس جانا پڑے گا۔ دروازہ کھل گیا۔ کوڑے کرکٹ اور دھول مٹی سے اَٹے احاطے میں دنیا کے عظیم المرتبت شاعر کا مرقد تھا۔ سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا یہ مرقد جانے کتنی کہانیاں دہرا گیا۔ اپنے خلوص کے اظہار کا کوئی طریقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے اپنے بیگ میں موجود اپنی کتابیں پھولوں کے ساتھ ان کے قدموں میں رکھ دیں اور باہر نکل آئے۔

وہاں کے لوگوں کو علم نہیں تھا کہ یہ مزار کس کا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ غالب اکیڈمی ساتھ ہی تھی مگر اس کے ڈائریکٹر باہر گئے ہوئے تھے۔ اکیڈمی دس بجے کے بعد کھلنا تھی۔ اس وقت تک ہم انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ گیٹ پر موجود شخص کو میں نے اور نیلما نے اپنی اپنی کتابیں دیں پاکستان پہنچنے پر ان کا شکریہ کا خط بھی آ گیا۔ اب ناشتے کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ ایک قدرے صاف ستھرے ہوٹل میں نان، پوری، چنے، چائے لسی کا ناشتہ کیا۔ کچھ فریش ہوئے۔ سامنے PCO تھا۔ سب نے گھر فون کیا اور اس دوران میں لوگوں سے یہاں موجود مزید اہم مقامات کے متعلق تفصیل معلوم کرتی رہی۔ علم ہوا کہ ہمایوں کا مقبرہ بھی یہاں سے قریب ہی ہے۔ سرخ اور سفید پتھروں سے یہ مقبرہ ہمایوں کی بیوی حاجی بیگم نے تعمیر کروایا تھا۔ پہلے اس کے چاروں طرف باغ تھے اب یہ مقبرہ آبادی میں گھر کر اپنی خوب صورتی کھو بیٹھا ہے۔ یہ مقبرہ ہندوستان میں مغلیہ تعمیر کا اوّلین نمونہ ہے۔ مورخین کے مطابق یہ مقبرہ مغلیہ فن تعمیر کی ابتداء اور تاج محل اس کی انتہا ہے۔ ہمیں افسوس رہے گا کہ وقت کی قلت اور ساتھیوں کی رائے نہ ہونے کے باعث ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔ لال قلعے کو ہم باہر سے دیکھ چکے تھے۔ شاہ جہاں نے آگرہ سے اپنا دارالحکومت جب دہلی منتقل کیا تو سرخ پتھروں سے 1638ء میں یہ قلعہ تعمیر کروایا جو 1648ء میں مکمل ہوا۔ یہ قلعہ لاہور کے شاہی قلعے سے ملتا جلتا تھا۔ دہلی میں تین ہزار ایک سو قابل دید مقامات ہیں اور ایک دن میں ہم کیا کیا دیکھ سکتے تھے۔ ہم افسوس کے سوا کیا کر سکتے تھے۔

میاں حبیب رکشہ والوں سے چاندنی چوک جانے کے لیے کرایہ طے کر رہے تھے اور

میں سوچ رہی تھی یہاں قطب مینار بھی تو ہے جس کا ذکر سکول کی درسی کتابوں میں پڑھا تھا۔ قطب مینار جو ہندوستان کی پہلی مسجد جو 1099-1199 میں بنی اور یہاں سے اسلام کا آغاز ہوا۔ قطب مینار کی بلندی 73 میٹر ہے جس پر چڑھنے کے لیے 238 سیڑھیاں ہیں۔ یہ سیڑھیاں بھی ہم ضرور چڑھیں گے کیوں کہ یہاں اوپر جا کر بالکونی سے پورے شہر کا نظارہ ہوتا ہے۔ ہم نے پھر کسی مقامی شخص سے اس کا پتہ پوچھا۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک وسیع سبزہ زار کے اندر ہے، اس کی پانچ منزلیں ہیں۔ اسی سبزہ زار میں دیگر عمارات کے کھنڈرات بھی ہیں۔ میں تصور کی آنکھ سے سب کچھ دیکھ رہی تھی اور ہمارے ساتھی چاندنی چوک جانے کے لیے رکشہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دو آٹو رکشاز لیے گئے اور ہم عازم چاندنی چوک ہوئے۔

ذہن میں ابھی تک مزارات پر جا کر حاصل ہونے والا روحانی کیف وسرور اور تشنگی باقی تھی۔ رکشہ مصروف سڑکوں اور ٹریفک میں سے ہوتا ہوا شاہ عالمی اور انار کلی سے ملتے جلتے بازار میں نیبو پانی کی ایک ریڑھی کے سامنے رک گیا۔ ہم نے طے کردہ کرایہ ادا کیا۔ صغریٰ اور میاں حسیب وغیرہ ہمیں نظر نہیں آئے۔ میں، نیلما اور رخشندہ اُتر کر بازار کا سروے کرنے لگے۔ پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ نیبو پانی پر گزارہ ہو سکتا تھا مگر طبیعت نہیں مان رہی تھی۔ ٹیں ڈائٹ بوتل کے علاوہ کوئی ڈرنک نہیں لے سکتی تھی اور یہاں ڈائٹ کہیں نہیں ملی۔ ہمارے پیچھے دکان داروں کے ایجنٹ پڑ گئے۔ انہیں علم ہو گیا تھا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔ کئی ایجنٹ ہمارے پیچھے تھے۔ ہم پریشان سے ہو گئے۔ آخر ایک شخص ہمیں ساڑھیوں کی دکان تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے حال ہی میں پاکستان سے بیٹی کی شادی کے سلسلے میں خاصی شاپنگ کی تھی۔ مجھے شاپنگ کی کوئی خواہش نہیں تھی ہاں بازار اور چیزیں میں ضرور دیکھنا چاہتی تھی۔ رخشندہ اور نیلما نے بہت اچھی شاپنگ کی۔ اپنی طرف سے چیزوں کے دام بھی خاصے کم کروائے۔ میں نے بھی چار ریشم کی ساڑھیاں خریدیں مگر بعد میں علم ہوا کہ اور لوگوں نے ہم سے بھی سستے داموں چیزیں خریدیں۔ بہ مشکل دو گھنٹے کے بعد ہم اس دکان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ آگے جا کر صغریٰ صدف، میاں حسیب اور طالب بھی مل گئے۔ آپس میں چیزوں کی قیمتوں کا تبادلہ ہوا۔ طے

پایا کہ جس دکان سے انہوں نے کپڑا خریدا ہے ہم بھی وہاں جا کر خریداری کریں گے۔ راستے میں جیولری کی دکانیں آ گئیں۔ خواتین و حضرات زیوارت کی خریداری میں لگ گئے۔ مصنوعی زیورات جو یہاں کی خاص چیز ہے اصل سے مماثل ہوتے ہیں۔

میں بہت تھک چکی تھی اور پیاس بھی بے حد لگ رہی تھی۔ میں اور صغریٰ صدف ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ میں نے مجبوراً دکان سے نیبو پانی لے کر پیا۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد شاپنگ کا یہ دَور ختم ہوا۔ آگے تو پورے بازار میں ہمارے لوگ گھوم رہے تھے جو شکل شناسا تو تھے لیکن ناموں کا علم نہ تھا۔ دو حضرات نے ہم سے درخواست کی کہ وہ گھر کی خواتین کے لیے خریداری کرنا چاہتے ہیں، ان کے نام میرے ذہن سے نکل گئے ہیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر دوسرے گروپ کی تلاش کردہ دکان میں داخل ہوئے۔ خریدار زیادہ تھے۔ ہم نے 300 کی چیز اڑھائی سو میں کروالی اور پھر سب نے دھڑا دھڑ ساڑھیاں، سوٹ خریدنا شروع کر دیئے۔ میں پسند کر کے کپڑے نکلواتی جا رہی تھی۔ وہ لوگ منتخب کر رہے تھے۔ میں نے بھی یہاں سے دو مزید ساڑھیاں خرید لیں۔ پاکستان میں بہت سے تحائف دینا پڑتے ہیں۔ یہ کچھ عجیب رواج ہے کہ دوسرے ملک کی سوغات ضرور لاؤ۔ میں اس رواج کو آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہوں۔ فضول رسم و رواج آزادی کو ختم کر دیتے ہیں۔ سامان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسٹم پر مشکل پیش آتی ہے۔ صرف ٹوکن ہونا چاہیے اور وہ کوئی چھوٹی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ پہلے جو لوگ زیادہ پیسے دے کر ساڑھیاں وغیرہ لے گئے تھے ان کو یہی قیمت کروا کر دی۔ اس میں انہوں نے اور چیزیں خریدیں، لوگ دکانوں میں بکھر چکے تھے۔ اکٹھے نہیں ہو پا رہے تھے۔ نیلما اور رخشندہ نے ایک اور دکان میں مناسب داموں پر اور سامان پسند کر لیا تھا۔ سب لوگ اس دکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ میں سیڑھیاں اتر گئی۔ ساتھ صغریٰ صدف تھی، ہم نیچے اُترے تو ایک گورو دوارا سامنے تھے۔ لیکن یہ خوف تھا کہ اگر اندر جائیں تو کہیں ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ خدا خدا کر کے سب اکٹھے ہو گئے۔ اگلا پڑاؤ جامع مسجد تھا۔ کل جو دوپٹے خریدے تھے وہ تحائف کے لیے دیگر احباب نے خریدنے تھے۔ یہ فاصلہ کوئی ڈیڑھ دو کلومیٹر تھا لیکن سب لوگ بے حد تھک چکے تھے۔

وہاں تک جانے کے لیے سائیکل رکشہ ہی میسر تھا۔ تین رکشے لیے، سامان کے بڑے بڑے بیگز کے ساتھ اس میں بیٹھے۔ سائیکل چلاتے انسانوں پر ترس آرہا تھا، پھر بھی سواری کرنے پر مجبور تھے۔ وہ پیٹ کے ہاتھوں، ہم تھکن کے ہاتھوں۔ جامع مسجد پہنچ کر اس کے نزدیک سامان ڈھیر کر کے باری باری بازار جانے کی منصوبہ بندی کی۔ شکر ہے یہ مرحلہ جلدی طے ہوگیا۔ بھوک زوروں پر تھی۔ نیچے بریانی اور دہی بھلے کی دکان تھی۔ سب نے حسب پسند نوش کیا اور رکشوں کی تلاش شروع ہوئی۔ آندھی چلنے لگی تھی۔ بادل گھر آئے تھے۔ ہمیں پنجاب بھون پہنچ کر واپسی کی تیاری بھی کرنا تھی۔ ٹیکسیاں مل گئیں اور ہم پنجاب بھون پہنچ گئے۔ فرخندہ لودھی جنہیں میں فرخندہ آپا کہتی ہوں، ہمیں آواز دیتی رہیں جس کا بعد میں علم ہوا۔ ہم جلدی میں سن نہ سکے۔ وہ شاپنگ کے لیے جانا چاہتی تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر سامان پیک کیا۔ بارش شروع ہوگئی تھی۔ موسم خوش گوار ہوگیا تھا۔ سامان بسوں میں رکھوا کر پنجاب بھون کے میس میں کھانے کے لیے گئے۔ کھانا سستا، مزیدار اور صاف ستھرا تھا۔ میس بھی اچھا تھا۔ اب واپسی کے سفر کی تیاری تھی۔ تھکن اور نیند سے برا حال تھا لیکن مجھے اچھی طرح علم تھا کہ میں بس میں بیٹھنے کے بعد قطعاً سو نہیں پاؤں گی۔ ساتھ ہی یہ امید بھی تھی کہ شاید تھکن کی وجہ سے نیند غلبہ پالے۔ ہم بسوں میں جاکر بیٹھ گئے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ صبح چھ بجے امرتسر پہنچنا تھا جہاں کمشنر ہاؤس میں ناشتے کا انتظام تھا۔ گیارہ بجے بسیں روانہ ہوئیں۔ نیلما حسب عادت بس چلتے ہی خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگیں۔ مجھے ان کی یہ عادت بہت پسند آئی۔ سونے سے کم از کم تھکاوٹ تو اُتر جاتی ہے۔ راستے میں بس ایک جگہ رُکی۔ پانی پت کے قریب ایک ڈھابہ تھا۔ یہاں جو لوگ سو رہے تھے وہ سوتے رہے، باقی لوگوں نے اُتر کر چائے پی۔ یہاں پر پنج رنگا اچار، آم پاپڑ مل رہے تھے۔ میں نے بھی اچار اور آم پاپڑ خریدے۔ بس تمام رات چلتی رہی۔ صبح کے وقت لوگ جنگلوں میں جابجا بیٹھے دکھائی دیے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ لوگ جھونپڑی نما گھروں میں رہتے ہیں۔ وہاں ٹائلٹ نہیں ہوتے۔ یہ لوگ ''جنگل پانی'' کا رُخ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھوں میں گڈویاں لیے جا رہے تھے، ان میں غالباً پانی تھا۔ ان لوگوں کو پرواہ نہیں تھی کہ سڑک سے کوئی ان کو دیکھ رہا ہے۔ سفر لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ بس

ایک بار پھر جالندھر کے نزدیک حویلی ریستوران پہ جا رکی۔ ناشتہ تو امرتسر کرنا تھا لیکن صبح ہو چکی تھی۔ رات بھر کے جگ راتے سے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ حویلی کے باتھ روم انتہائی صاف ستھرے ہیں۔ مٹیاروں کے باتھ روم میں جا کر دانت برش کیے، وضو کیا۔ باہر آ کر ایک کپ چائے پی۔ نیلما نے پائن ایپل جوس لیا۔ کچھ لوگ لسی انجوائے کر رہے تھے۔ فریش ہو کر پھر سفر کا آغاز کیا۔ کوئی دس بجے امرتسر کے ریسٹ ہاؤس پہنچے جہاں پر سرکاری ٹیم ہماری تواضع کے لیے موجود تھی۔ وہ صبح سے انتظار کر رہے تھے۔ بھوک بہت چمک چکی تھی۔ پوری چنوں کا لذیز ناشتہ تھا۔ چائے کی بجائے لسی تھی اور وہ میٹھی تھیں جو میں نہیں لے سکتی تھی۔ اب لوگ گروپوں میں بٹ گئے۔ پہلے اعزاز احمد آذر گروپ لیڈر تھے مگر اب وہ امرتسر والے گروپ کے ساتھ رکنا چاہ رہے تھے۔ باقی لوگوں نے بارڈر کراس کرنا تھا۔ رضیک کور بھی ہم سے آملی تھی۔ وہ امرتسر میں ہوتی ہے۔ بسوں نے جلیانوالہ باغ سے بہت پیچھے ہمیں اُتار دیا۔ ہمیں پیدل ہی جلیانوالہ باغ اور گولڈن ٹمپل جانا تھا۔ یہ وہی گولڈن ٹمپل ہے جہاں آج سے بیس سال پہلے بھارتی فوج نے آٹھ سو سکھوں کو بھون ڈالا تھا۔ ہم پیدل چلتے ہوئے ایک بازار سے گزرے۔ راستے میں بہت سے لوگ ننگے پاؤں جا رہے تھے۔ علم ہوا کہ انہوں نے منت مانی ہے اور یہ گولڈن ٹمپل کی طرف ننگے پاؤں جا رہے ہیں۔ آگے جا کر ایک تنگ سی گلی آئی۔ اس سے گزر کر ہم جلیانوالہ باغ میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک یادگاری مشعل روشن تھی۔ یہاں 1919ء میں جنرل ڈائر نے باغ کا مرکزی دروازہ بند کر کے سیدھی فائرنگ کا حکم دیا تھا۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''تماشہ'' بھی اسی سانحے کے حوالے سے ہے۔ سانحہ جلیانوالہ کے وقت منٹو کی عمر چھ سات سال تھی۔ اس افسانے میں انہوں نے ایک چھ سالہ بچے خالد کے جذبات کے بیان ہی میں دراصل اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ ہم سب لوگ بے حد جلدی میں تھے کیوں کہ آج ہی واپسی تھی۔ واہگہ بارڈر 12 بجے سے پہلے پہنچنا ضروری تھا اس لیے باغ کا اندرونی حصہ تفصیل سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ایک سرسری سی نظر ڈالی، تصویریں اُتاریں اور باہر آ گئے۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر گولڈن ٹمپل تھا۔ وہاں تک پیدل جانا اور پھر بسوں تک اسی چلچلاتی دوپہر میں واپس آنا تھا۔ گولڈن ٹمپل پہنچے، یہاں

بھی جوتیاں باہر اُتارنے کا انتظام تھا اور پاکستان کی طرح جوتیاں رکھ کر ٹوکن دیئے جا رہے تھے۔ لیکن ایک بات نے حیرت زدہ کر دیا کہ جوتے رکھنے والے ڈاکٹر، انجینئر، دانش ور اور بڑے لوگ تھے۔ ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک دن یہ لوگ بلامعاوضہ لوگوں کی جوتیاں سنبھالنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور لوگوں سے بھی اس کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ جب کہ ہمارے ہاں مزارات پر کئی دفعہ رکھوالا منہ مانگے دام بھی طلب کرتا ہے، مقررہ ریٹ کے علاوہ...... تمام صحن میں پانی رواں تھا اور کچھ دریاں بچھی ہوئی تھیں جو گیلی تھیں تا کہ لوگوں کو گرمی محسوس نہ ہو۔ فرش پر پانی گرم ہو تو دریوں پر پاؤں ٹھنڈے کر لیں۔

آگے ایک برآمدہ کراس کر کے چاروں طرف پانی کے بیچوں بیچ گولڈن ٹمپل اپنی آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ بہت ہی خوب صورت منظر تھا۔ سکھ عقیدت مند فرش پر سجدہ کر رہے تھے۔ رضیک کور نے بھی سجدے میں گر کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ میں اور نیلما باہر نکل آئے۔ شکریہ کے ساتھ جوتیاں لیں اور باہر دکانوں پر آ گئے۔ وہاں سے ہم نے سلور رنگ میں موتیوں کے پروئے ہوئے چھوٹے اور بڑے کڑے لیے، ان کو سمرن کہتے ہیں۔ یہ کڑے وہ اپنی عبادت میں گنتی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سب لوگ بکھر چکے تھے۔ میں اور نیلما بس کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں پاپڑ اور بڑیوں کی دکانیں آئیں لیکن میں گروپ سے الگ ہو کر یہاں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نیلما کو بھی میں نے خریداری نہیں کرنے دی۔ رکشے والے ہمیں پردیسی جان کر کپڑا مارکیٹ لے جانے کی دعوت دے رہے تھے۔ فقیر ہمارے پیچھے پیچھے تھے۔ گرمی، مکھیاں اور طویل راستہ۔ نیلما نے مور پنکھ کا پنکھا خریدا۔ ہم چوک کے قریب پہنچے اور ہماری بسوں کی بات استفسار کر ہی رہے تھے کہ سامنے سے بس آتی نظر آئی۔ پروین عاطف اس میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں بڑی مشکل سے بس لا کر آپ سب کو لے جانے آئی ہوں۔ لوگوں کا جمع ہونا بے حد مشکل تھا۔ بس گولڈن ٹمپل کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ لوگوں کی گنتی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اتنے میں رضیک کور بس میں آئی۔ نیلما سے پوچھا کہ پاپڑ بڑیاں یہاں کی سوغات ہے، وہ تو لے لو۔ نیلما نے اس کے پیسے دیئے، وہ اس کے لیے پاپڑ اور بڑیاں لے آئی۔ خدا خدا کر کے سب

اکٹھے ہوئے اور بس واہگہ بارڈر کی جانب روانہ ہوئی۔

دو بجے بارڈر پر پہنچے۔ اٹاری پر پاسپورٹ چیک ہوئے۔ پہلے سے طے شدہ فارم جمع کروائے۔ چار چار لوگوں کو اکٹھے گیٹ پاس دیا۔ میرے ساتھ زمان صاحب اور دو حضرات تھے۔ ہم نے سب سے پہلے بارڈر کراس کیا اور پاک سرزمین میں داخل ہو گئے۔ ایک عجب قسم کی مسرت اور طمانیت محسوس ہوئی۔ واہگہ بارڈر پر پاسپورٹ چیک کرانے تھے۔ وہاں ناول نگار، کہانی کار اور شاعرہ روشن آراء اپنے شوہر زاہد عکاسی کو لینے آئی تھیں۔ ان سے دعا سلام ہوئی۔ یہ مرحلہ بھی جلد ہی طے ہو گیا۔ اکرام صاحب کے آفس سے، گھر سے گاڑیاں منگوانے کو فون کیا۔ نیلما اور رخشندہ بھی پہنچ چکی تھیں۔ اور اس وقت سب کو بھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ میری گاڑی آ گئی۔ سب کو خدا حافظ کہا اور بارڈر کی حد بندی سے باہر آ گئے۔ سفر کا بے حد لطف آیا لیکن جو لطف اپنے ملک کی سڑک پر نہر کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آ رہا تھا اس کا الگ ہی مزہ تھا۔ پاکستان زندہ باد۔

باب آزادی سے باب ہند میں داخلہ

انڈیا آمد پر استقبال

دیوسماج کالج کی پرنسپل کے ساتھ فوٹو (چنڈی گڑھ)

دائیں سے بائیں: بشریٰ اعجاز۔ پرنسپل مسز ستیندر ڈھلوں۔ شہناز مزمل۔ نیلما ناھید۔ فرخندہ لودھی

شہناز مزمل: کانفرنس و مشاعرہ (چنڈی گڑھ)

دیوسماج کالج کانوکیشن ڈے (چندی گڑھ)

رمنیک کور۔ نیلما ناہید۔ شہناز مزمل ۔ رخشندہ نوید

ہوٹل موہن انٹرنیشنل (امرتسر)

جلیانوالہ باغ۔ مشعل (امرتسر)

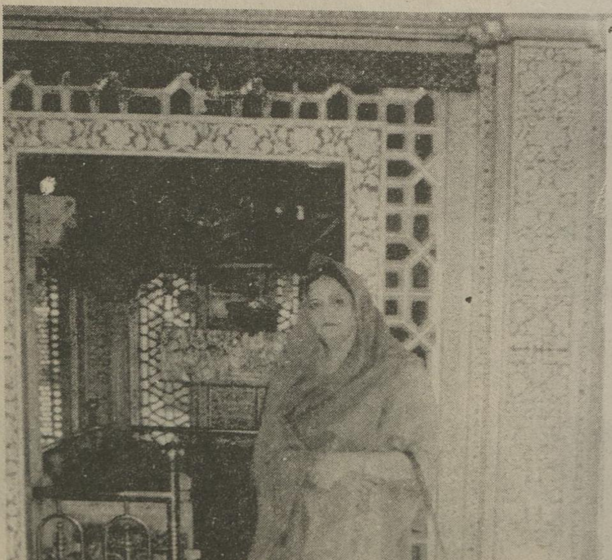

حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر (دہلی)

مزاحضرت امیر خسرو۔ شہناز مزمل

شہناز مزمل: غالب کے مزار پر

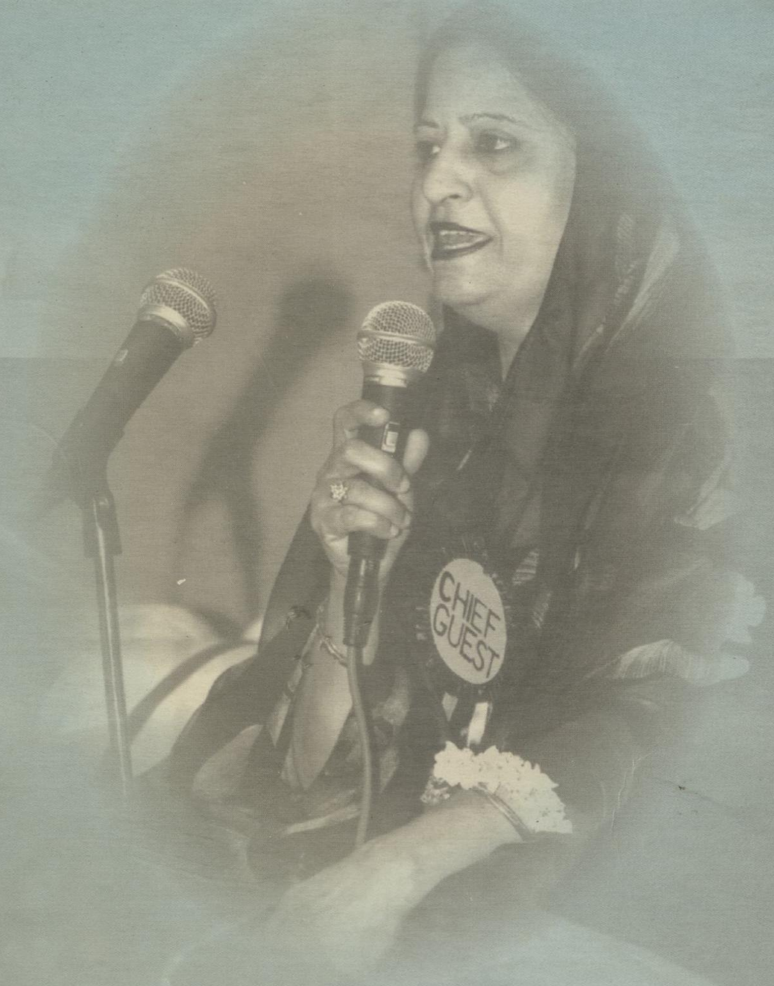

ندا